ام الیقین

کیونکہ میں جان چکی ہوں کہ یقین کسے کہتے ہیں اور معجزے کن کے لیے ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ہر انسان کے لیے۔ اللہ کی طرف سے میرے لیے۔

سمیرا حمید __

Sumaira Hameed:Author

رب العالمین کے نام سے شروع

''اُم الیقین''

☆ ☆ ☆

حدی ...... یہ اس کا نام ہے ......

اور اس کی کھلی چھت کی گرے آڈی کار، سگنل کو تقریباً توڑتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے اپنی رفتار کو ہوا سے ملا دینے کو ہے۔ امریکیوں کو کوئی چیز اتنا غصہ نہیں دلاتی، جتنی تیز رفتار گاڑیاں۔ شکاگو کی سڑک پر اس نے کار کو قابو میں رکھتے ہوئے بے قابو ہو جانے دیا۔ ''گرلز لائیک یو'' کا والیوم تیز کیا۔ بیک ویو مرر میں اس نے سگنل پر بریک لگانے والوں کو منہ بناتے، کھڑکی سے سر باہر نکال کر گالیاں دیتے ہوئے دیکھا۔

مرر میں دیکھ کر ہی اس نے انہیں آنکھ ماری۔ جیسے وہ اس کی آنکھ ہی تو دیکھ رہے تھے۔ زیر لب گالیاں دیتے ہوئے وہ تو اس کی آنکھ پھوڑ دینا چاہتے تھے۔ جو ان کے درمیان سے کار کو ایسے نکال کر لے گئی تھی کہ خود بھی مرنے والی تھی اور ان کی گاڑیاں بھی الٹ دینے والی تھی ......

کار کی رفتار بڑھی تو اس کے بلونڈ بال ہوا کے ساتھ اُوپر کی طرف لہرائے۔ فٹ پاتھ پر چلتے کتنے ہی لوگوں نے کھلی چھت کی کار میں بیٹھی اس لڑکی کو دیکھنا چاہا تھا۔ بہت دُور سے ہی اس کی شبیہ بتا رہی تھی کہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ایٹم بم بیٹھا ہوا ہے۔ ایسے چھچھورے لوگوں کو جتنی بھی گالیاں دی جانی چاہیے، دیکھ کر دینی چاہیے ...... وہ تو بس اسی لیے اسے دیکھنا چاہتے تھے ......

سڑک پر کاروں کو ڈج کرتے، رفتار بڑھاتے ہوئے، اس نے مرر میں سر کو ذرا سا جھکا کر خود کو دیکھا۔

''واؤ ...... کلنگ ......'' اس نے خود پر کمنٹ پاس کیا۔

کار کی رفتار کچھ ایسی اندوہناک ہو چکی تھی کہ فٹ پاتھ پر چلتے بچے کے ہاتھ سے غبارہ چھوٹ گیا، آئسکریم گر گئی ......

''سوری کڈ ......''

وہ بہت آگے نکل آئی تھی، پھر بھی مرر میں دیکھتے ہوئے، ہاتھ لہرا کر بچے سے کہا جو منہ بسور کر آسمان پر اُڑتے غبارے اور زمین پر گری آئسکریم کو دیکھ رہا تھا۔ بچپن کے غم چھوٹے اور تکلیف بڑی ہوتی ہیں۔ بچے کے فیس کے تاثرات نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

مسکرانے کے لیے اسے بہانوں کی ضرورت نہیں رہتی تھی ...... اس کے پاس سب یقین موجود تھے ......

وہ کیسی بھی اسٹوڈنٹ رہی تھی لیکن کانوکیشن تقریب کو پوری اہمیت دینا چاہتی تھی۔ ایگزمز کا دریا انہوں نے تیر کر نہیں، جل بھن کر پار کیا تھا۔ دنیا میں چار سیزن موجود تھے، تو دنیا والوں کو پانچواں سیزن ''ایگزمز سیزن'' دریافت اور ایجاد کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ سردیوں میں ٹھنڈ لگنے کا ''صرف خطرہ'' رہتا ہے جبکہ ایگزمز سیزن میں موت پڑنے کا امکان عام دنوں سے کہیں زیادہ بڑھ

Sumaira Hameed:Author

جاتا ہے۔ چند ایک لائق اسٹوڈنٹس کو چھوڑ کر سب ''فوت نیا'' (موت نمونیا) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہی سیزن جس سیزن میں بڑے سے بڑے اسٹوڈنٹ کو منہ لگانا پڑتا ہے کہ کیا پتا وہ ایگزمز میں کسی کام ہی آ جائے۔

تو ایگزمز اس نے کیسے بھی دیے تھے، کانوکیشن کی تقریب کے لیے اس نے ایسے تیاری کی تھی جیسے اقوام عالم کے لیڈر کی حیثیت سے کل عالم کے سامنے تقریر کرنی تھی......

اقوام ناکارہ عالم کی لیڈر..... ھدیٰ..... کی آڈی یونیورسٹی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کی کار سے کچھ اسٹوڈنٹس بس ہلاک ہوتے ہوتے بچے تھے۔ انہیں سوری کہتے ہوئے وہ پارکنگ میں کار کو پارک کر چکی تھی۔ ڈیش بورڈ سے مرر نکال کر اس نے ہاتھ میں لیا، اور سب سے پہلے اپنے بال سیٹ کیے۔ کار سے باہر نکل کر، گلاسز اتار کر لپ گلوز کا ایک کوڈ کیا۔ مرر کو کار کی سیٹ پر اچھال دیا۔ اس کے موبائل پر اس کی فرینڈز کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال پک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

Dior کی پنک فراک کی دونوں پاکٹس میں اس نے اپنے ہاتھ زن کیے۔ خود کو، اپنی چال کو، Dior کے ڈریس کے مطابق کوڈ کیا۔ ہر لباس کی ایک چال ہوتی ہے۔ dior کے ہر ڈریس کی چال ''شاہانہ'' تھی اور وہ ہر چال پر قادر تھی۔ فراک کی بیک وی شیپ میں کمر تک بیک لیس تھی۔ اس وی میں بیک نیک نیکلس کی لمبی چین ہلکورے لے رہی تھی۔ جس کے آخری کنارے لگا سفید پنڈولم اس کی چال کے ساتھ ساتھ ڈول رہا تھا......

کمر اور شانوں کو سیدھا رکھ کر، ٹھوڑی اور چہرے کو غیر محسوس خم دیتے ہوئے، ہائی ہیلز میں مقید اپنے پیروں کو اس نے روش کی سمت بڑھا دیا۔

دھوپ میں چمکتا اس کے بالوں کا ملا جلا گہرا سنہرا رنگ..... آنکھوں پر رکھے گلاسز..... تنی ہوئی گردن اور اٹھی ہوئی ٹھوڑی..... وہ حسن اور فیشن کی دنیا میں راج کرنے کے لیے بے تاج بنی تھی......

ہیل کی ٹک ٹک روش پر سنائی دے رہی تھی..... راستے میں آتا والا ہر اسٹوڈنٹ ترچھی یا ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھنے کی کوشش یا جسارت کر رہا تھا کہ دیکھ بھی لیا جائے اور پکڑا بھی نہ جائے۔ وہ اکیلی ہی یونیورسٹی میں خوب صورت لڑکی نہیں تھی، لیکن وہ اکیلی ہی اتنی پاپولر اور فیشن ایبل تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی تھی، نہ ہی اس کے استعمال کے طریقوں کی۔ ساری یونیورسٹی جانتی تھی کہ وہ اور اس کے گروپ کی ہر لڑکی یونیورسٹی صرف اس لیے آتی ہے تا کہ وہ اپنا آپ دکھا سکے۔ ان جیسا ٹرینڈ سیٹنگ فیشن کر کے گھر میں بیٹھنا کون پسند کرے گا؟ اس لیے وہ گھر نہیں بیٹھتی تھی، اپنی نمائش کرتی رہتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے یا ڈگری لینے سے کیا مطلب ہو سکتا تھا بھلا۔ نہ اسے جاب کرنی تھی نہ اسکالر شپ لینا تھا۔ نہ ہی یونیورسٹی ڈین سے شانے پر تھپکی اور رویل ڈین کی سرگوشی..... huh..... ایسا تو مذاق بھی نہیں کیا جانا چاہیے تھا......

اگر پیسہ زندگی کا مسئلہ تھا تو یہ مسئلہ اس کے والدین حل کر چکے تھے۔ اگر زندہ رہنے کے لیے کسی کریئر کا ہونا ضروری ہے تو وہ یہ کریئر بھی حاصل کر چکی تھی۔ ''انجوائے منٹ کریئر''۔ ابھی وہ صرف بائیس سال کی تھی اور اس نے آدھی دنیا کو اپنے آگے لگا لیا تھا، باقی کی دنیا کو

Sumaira Hameed:Author

وہ اپنے پیچھے رکھتی تھی...... جو بچ جاتی تھی اسے جوتی کی نوک پر......

پھر ان کی زندگیوں کے مقاصد کیا ہو سکتے تھے بھلا؟ ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان بننا؟؟ یہ سب انہیں پتھر کے زمانے کی باتیں لگتی تھیں۔ جب اُڑانے کے لیے پیسہ موجود تھا تو اس پیسے کو ''کمانے'' کی کیا ضرورت تھی۔ زندگی مخمل کی تھی تو اس پر ''مقصد'' کے ٹاٹ کا پیوند لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

پاکٹس میں ہاتھ دیے بچ جانے والی دنیا کو ہیل کی نوک سے مسلتے ہوئے وہ چل رہی ہے...... اس کی آئی کانک چال، انداز، اٹھان، نے اسے اتنا نمایاں کر دیا ہے، کہ دنیا کی ہر شے چھپ کر رہ گئی ہے۔ اس ڈریس کا آرڈر اس نے سب سے پہلے دیا تھا۔ اس کلوئی سے بھی پہلے۔ وہ تو عام دنوں میں ایسے ڈریس پہن کر آتی تھی کہ جب وہ انسٹا اسٹوری شیئر کرتی تھی تو چند دنوں بعد کوئی نہ کوئی سیلبریٹی اس کی کاپی کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک بار نیوز پیپر میں آرٹیکل بھی آیا تھا کہ شوبز ایکٹریس انسٹا اسٹار ''ھدیٰ'' کو فالو کر رہی ہیں۔ اور اس کے فیشن ٹرینڈز سے انسپائر ہے۔ آج کی انسٹا اسٹوری تو آگ لگا دینے والی تھی......

''ہیلو ھدیٰ......'' اس کا کلاس فیلو امام اس آگ سے جھلنے آیا تھا۔ پیچھے سے تو وہ بھاگتا ہوا آیا تھا لیکن اس کے قریب آ کر ایسی نارمل چال چلنے لگا تھا جیسے چلتے چلتے اس پر نظر پڑ گئی، تو سوچا ہائے کہہ دوں۔

ہائے......'' اس نے پاکٹس میں سے ہاتھ نہیں نکالے تھے۔ سن گلاسز بھی نہیں اتارے تھے۔ مطلب ہائے کر لیا ہے اب آگے دفعہ ہو جاؤ۔ تم اگر تھوڑے بہت ضروری تھے بھی تو صرف ایگزمز تک۔ اب تو تمہارا نام یاد کرنے میں پانچ منٹ لگیں گے، اور پھر بھی چھٹے منٹ میں ''ہو دا ہیل از ہی۔'' ہی نکلے گا۔

''تمہیں بیک سے دیکھا تو ایسا لگا جیسے کیلی جینر جا رہی ہے۔ پھر سوچا اس کا ہماری یونیورسٹی میں کیا کام۔ بلکہ کسی بھی یونیورسٹی میں کیا کام...... ویسے تمہارا بھی اس یونیورسٹی میں کیا کام؟؟ کیا کرتی رہی ہو تم یہاں؟'' وہ آگے دفعہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے، اپنے ذلیل ہونے کے اہتمام کرنے لگا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک دم سے رکی۔ پاکٹ میں سے ایک ہاتھ نکالا اور سن گلاسز اتار لیے۔'' کیلی جینر...... تم نے مجھے کیلی کہا؟؟'' اس کی دلکش آنکھوں میں تندی سمٹ آئی۔'' huh...... کیلی......؟؟ وہ سرجریوں کی دکان...... بیہودہ چوزی...... تمہیں لگا وہ میں ہوں؟؟'' اس کا اتنا اچھا دن، ایسے برے انسان کے منہ لگ کر خراب ہونے والا تھا۔

''اس کا باپ مرغا، ماں مرغی اور وہ خود چوزی ہے؟ اینی وے! اس کی شہرت نے آگ لگا رکھی ہے...... مطلب ہر طرف...... اور پیاری بھی بہت ہے وہ۔'' امام...... شروع میں وہ تو تھوڑا سا سہم گیا تھا۔

''پیاری؟؟ مائی فٹ...... مجھے گالی دے دینا، کبھی اس سے میچ نہ کرنا۔'' ہونٹوں کو بھینچ کر اس نے خود کو گالی دینے سے روکا۔

''اس مہینے وہ ٹائمز کے کوور پر بھی آئی ہے۔ دنیا کی سب سے کم عمر، امیر ترین بزنس گرل، دی کیلی جینر۔ اتنی سی عمر میں اس نے کتنا کچھ کما لیا ہے۔ تم نے بھی تو اتنی سی عمر میں ''کافی'' کچھ کر لیا ہے۔ مجھے لگا تم اسے پسند کرتی ہو۔ تمہاری حرکتیں بھی اس سے میچ کرتی

Sumaira Hameed:Author

ہیں۔ پھر اس کے نام سے چڑ ی کیوں؟؟'' پہلے وہ سہم رہا تھا اب شیر ہو رہا تھا۔

''میں اپنی صحت کا خیال رکھوں یا نہ رکھوں، اپنے ٹیسٹ کا ضرور رکھتی ہوں...... تھوڑا خیال تم بھی رکھو اور مجھے گھورنا بند کر کے سامنے دیکھ کر چلو۔ میری ہیل سے الجھ کر گرے تو کچھ کہہ نہیں سکتی کہ ہاسپٹل کے بیڈ سے اٹھو گے، یا مردہ ہو کر تابوت سے......'' سن گلاسز اس نے واپس اپنی آنکھوں پر لگائے اور چلنے لگی۔

''آں...... گرا دو...... گرا دو...... لیکن کیا ہی اچھا ہو جو دم تمہاری بانہوں میں نکلے۔ اوہ! غصہ نہ کرو۔ ذرا یاد کرو میں تمہارا کلاس فیلو ہوں۔ پہچانو مجھے......''

''پہچان لیا ہے...... اپنی طرح کے سنکی اسٹوڈنٹس کے رابن ہڈ ہو تم...... خبیث......''

''کیا کہا...... رابن ہڈ؟ تم رابن کا نام جانتی ہو؟ واؤ! میں تو تمہیں بالکل ہی جاہل سمجھتا تھا۔ یعنی کتاب وغیرہ جیسی چیزیں پڑھ لیتی ہو۔ اور آخ خبیث...... تمہارے منہ سے نکلا تو یہ بھی فیشن ایبل، آئی کانک ہو گیا...... کلنگ......'' اس نے ریپ سنگر کی طرح ہاتھ سے ہوا کو کاٹتے، گھٹنے ٹیڑھے کرتے ہوئے کہا۔

''ذلیل...... کمینے...... خبیث......'' ''یہ تینوں ایک ساتھ کیسے لگے؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ ''سپر آئی کانک؟'' ابرو اوپر اٹھ چکی تھی۔

وہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ ''سب ٹھیک کہتے ہیں، تم سے بات کر کے مزا آ جاتا ہے۔ پارٹیز وغیرہ میں سننے سنانے کے لیے دو تین لطیفے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ افسوس یونیورسٹی کے یہ سال اتنی جلدی گزر گئے۔ ویسے تم جیسے سپر اسٹار اسٹوڈنٹس نے ہم جیسے سپر کنگال اسٹوڈنٹس کو ڈائریوں میں لکھنے کے لیے اتنا مواد دے دیا ہے کہ اگر ہم ان ڈائریوں کی کتابیں چھپوالیں تو وہ بیسٹ سیلر ہوں، موویز بنوالیں تو وہ آسکر وننگ ہوں......''

''اور اگر تم انہیں اپنے تھوبڑوں پر سجا لو تو عالمی منڈیوں میں تمہاری ''سپر نیلامیاں'' ہوں......''

''ہاہاہا...... دیکھا، کیسی پیاری باتیں کرتی ہو تم۔ تمہیں کیا پتا ہم تمہیں کتنا یاد کرنے والے ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہارا ایک عدد مجسمہ بنوا کر اپنے کمرے میں رکھوا لوں۔ جب جب بور ہونے لگوں، تب تب تمہارے منہ لگ جایا...... میرا مطلب تمہارے منہ سے کھری کھری سن لیا کروں......''

چلتے چلتے اسے پھر سے رک جانا پڑا...... ائم زیر لب ہنس دیا۔ وہ اس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اور سرخ کرنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھوں سے گلاسز اتار لیے......

''کافی مہنگی لگتی ہے...... کہاں سے لیں...... اوہ اچھا...... لیں نہیں بلکہ بنوائی ہے...... signature ہے یہ بھی۔''

''تمہیں میں عجیب لگتی ہوں؟؟'' ائم کی ہاتھ بڑھا کر گلاسز اتارنے والی جرأت اسے نظر انداز کرنی پڑی۔

''ہاں...... لگتی تو مجھے بہت پیاری ہو لیکن لوگ کہتے ہیں کہ تم عجوبہ ہو...... نمونہ...... ڈالرز اور یوروز کا مجسمہ آزاری...... امریکا کو تم پر فخر ہے...... مجھے بھی تم پر فخر ہے میری بچی......'' اس نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

Sumaira Hameed:Author

''تو اپنی غربت کا بدلہ تم مجھ پر طنز کر کے نکال رہے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ سب غریبوں کو غریب ہونے کے فوائد رٹے ہوئے ہوتے ہیں، پھر بھی وہ امیر ہونے کی کوشش کرتے ہیں؟؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ اب اس نے ہاتھ بڑھا کر ائم کی آنکھوں سے آئی گلاسز اتاری تھیں۔ حقارت سے اس سستی، گھٹیا سی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ غریبوں کی ہر چیز بری ہوتی ہے۔

''کارآمد امیر ہونے اور ناکارہ امیر ہونے میں فرق ہوتا ہے حدی! اب بل گیٹس کو ہی دیکھ لو......''

''بل سے نکلے ہوئے چوہے کو دیکھ رہی ہوں۔ کم سے کم آج کے دن تو شرٹ چینج کر لیتے۔ پارٹ ٹائم جابس کر کر کے تمہاری شکل پر بارہ بج چکے ہیں۔ ان بارہ بندسوں کی پھٹکار تمہارے چہرے سے ہر سکینڈ، ہر منٹ ٹک ٹک کرتی برس رہی ہے۔ بارہ سال کسی بیوٹی سیلون میں بیٹھے رہے تو بھی شکل سے یہ پھٹکار غائب ہونے والی نہیں ہے......''

''میں یہ پھٹکار غائب کرنا بھی کیوں چاہوں گا؟ مجھے فخر ہے کہ......''

''مجھے فخر ہے کہ تم جیسے لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ مجھے ناپسند کرتے ہیں...... مجھ سے چڑتے ہیں...... لیکن پھر بھی تم جیسے لوگ ''مجھ جیسا'' ہی بننا چاہتے ہیں...... کیا میں غلط ہوں؟''

''تم غرق ہو...... خوش فہمی کے سمندر اور غلط فہمی کے چھپڑ میں......''

''فکر نہ کرو مجھے سوئمنگ آتی...... خوش فہمی کا سمندر اور غلط فہمی کا چھپڑ...... میں تیر کر پار کر لوں گی......''

''اور پھر خود پسندی کے گٹر میں جا گروں گی؟؟ کیا میں غلط ہوں......'' اب وہ پوچھ رہا تھا۔

اس کی لمبی گردن کی رگیں تن گئیں۔ غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں اس کی سانس کا ردھم ذرا سا تیز ہوا۔ ائم دیکھ سکتا تھا کہ اس نے ڈائنامائٹ کے ریگولیٹر کو چھیڑ دیا ہے۔ اگر یہ ڈائنامائٹ پھٹا تو عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔

''تم نے دو سال کے عرصے میں مجھ سے اتنی باتیں نہیں کیں، جتنی ان دو منٹوں میں کر لی ہیں۔ اس دو منٹ کی بات کے لیے تم نے دو سال ریہرسل کی ہو گی۔ آسان نہیں ہوتا مجھ جیسی لڑکی کو اپروچ کر کے بات کرنا۔''

''واقعی آسان تو نہیں تھا، یہی دیکھ لو کہ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا ہے۔ تمہارا کیا ہے، تمہارا گزارا تو اب تک دماغ کے بغیر ہوتا ہی آیا ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ اپنے بچوں کو سنانے کے لیے میرے ہاتھ اچھی کہانیاں لگی ہیں......''

''اچھا...... مثلاً کیسی کہانیاں......؟؟''

''میرے پیارے بچوں! تمہارے باپ کی یونیورسٹی میں ایک لڑکی ہوتی تھی۔ حدی...... میری کلاس فیلو تھی۔ وہ اتنی امیر تھی، اتنی امیر تھی، کہ بدنصیب تھی......''

''بدنصیب اور میں؟؟ کیسے......؟؟'' اس کے ڈائنامائٹ کا پارہ اوپر جا رہا تھا۔ مس عالم سے، عالمی جنگ کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔

''جسے سب پلیٹ میں سجا سجایا مل جائے، جسے کسی بھی چیز کے لیے کوئی کوشش نہ کرنی پڑے۔ زندگی جس کے لیے اسٹرابیری کیک کی طرح ہو۔ وقت جس کے لیے چاکلیٹ شیک کی طرح ہو۔ جس انسان کا مقصد شاپنگ کرنا، پیسوں کو اجاڑنا، گھومنا پھرنا، فیشن کرنا

Sumaira Hameed:Author

ہو...... ایسا انسان بدنصیب نہیں ہو گا تو کیا ہو گا؟؟''

اس نے قہقہہ لگایا۔ امامہ کے ہاتھ سے اپنے گلاسز جھٹکے سے واپس لیے اور آنکھوں پر لگائے۔

''مجھے بدنصیب کہنے اور ماننے کے باوجود تم پوری شدت سے یہ خواہش کرتے ہو کہ کاش یہ بدنصیب انسان تم ہوتے۔ کاش میری جگہ تم ہوتے...... یہ اسٹر بیری کیک کھانے کے لیے تمہیں ملتا۔ چاکلیٹ شیک تم پی رہے ہوتے......'' کہہ کر وہ چند سیکنڈز تک اسے دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

''دولت مند ہونا اگر گناہ ہے تو ہر شخص گناہگار ہونا چاہتا ہے۔'' امامہ کے آئی گلاسز روش پر پھینک کر جاتے ہوئے وہ یہ جملہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

روش پر اس کی ہیل کی ٹک ٹک ''زندگی'' کے شور کو دبا رہی تھی......

حقیقی زندگی، اس کی مجازی زندگی سے بہت پیار کرتی تھی، اسی لیے جلد ہی اسے موت سے روشناس کروانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کانوکیشن لان میں آئی تو ادھر ادھر کھڑے تقریباً ہر اسٹوڈنٹ کی گردن ایک سیکنڈ کے لیے اس کی طرف گھوم گئی تھی۔ وہ دیکھے بغیر بھی دیکھ سکتی تھی کہ سب اسے دیکھ رہے ہیں۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پوری طرح سے کھا، پی چکے تھے۔ لڑکیاں ایک ایک چیز کی قیمت کا حساب لگا چکی تھی، اور یہ جان چکی تھیں کہ وہ کتنی مہنگی تھی...... اتنی مہنگی کہ انہوں نے اپنی ساری کمائی، پوری بچت اڑا دی تو بھی وہ اس مہنگائی کو پاٹ نہیں سکیں گی......

دور دور سے گھورنے والوں کو اس نے پاکٹ سے ہاتھ نکال کر لہرا کر ''ہائے'' کہا۔ ویسے تو وہ صرف منہ دھو کر بھی آجاتی تو بھی وہاں موجود بہت سے لوگوں سے زیادہ خوبصورت لگتی' لیکن چونکہ وہ اچھی طرح سے تیار ہو کر آئی تھی تو بہت سے لوگوں کے دلوں پر بجلی گرا رہی تھی۔ وہ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ بس یہ بجلیاں سہنے کے لیے ہی بنے ہیں۔ وہ انہیں گھاس ڈالے گی نہ دانہ...... جیسے ایماء اُنسن کے وال پیپر لپ ٹاپ کی اسکرین پر لگا لینے سے ایما فون کر کے ڈنر پر انوائیٹ نہیں کرتی' ایسے ہی چپکے چپکے اس کی تصویریں کھینچ کر موبائل میں محفوظ کر لینے پر بھی وہ کسی کو ''شام کی چائے'' پر بلانے والی نہیں تھی۔

وہ مسکرائی اور ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا۔

''دن روشن ہے...... اچھا ہی ہے...... میں بھی تو خوش ہوں......''

اس نے دن پر رائے دی۔ دن کی روشنی سے ہائے ہیلو کیا۔ ''میں بھی تو خوش ہوں''، اس نے ایسے کہا جیسے باقی وقت وہ روتی دھوتی رہتی ہے۔ ایک ایک پینی کے لیے جان توڑ محنت کرتی پھرتی ہے۔ زندگی کے دکھوں کو حوصلے کے پہاڑ سے جھیلتی ہے۔ وہ بے چاری کتنی افسردہ رہتی ہے نا......

کانوکیشن کی تقریب سے پہلے ان فرینڈز کو فوٹو شوٹ کروانا تھا۔ ان کا گروپ اسپائس گرلز کے نام سے مشہور کر دیا گیا تھا۔ اسے اس

Sumaira Hameed:Author

گندے، فرسودہ سے نام سے نفرت تھی لیکن یہ بہر حال کار ڈیشن سے بہتر تھا۔ اسے کارڈیشن کلون سے ویسی ہی چڑ تھی جیسی امریکا کو روس کے خود سے پہلے خلا، میں چلے جانے سے تھی......

جب وہ فوٹو شوٹ کروا رہی تھیں تو ان کے کلاس فیلوز انہیں ''نا قابل برداشت ہو تم'' کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی میں جتنی مشہور تھیں اتنی ہی ناپسند بھی کی جاتی تھیں۔ وہ پانی کی طرح پیسہ بہاتی تھیں۔ اندھی ہو کر فیشن کی تقلید کرتی تھیں۔ ان کے انسٹاگرام کسی بھی ہالی وڈ اسٹار سے زیادہ فالو کیے جا رہے تھے۔ ان کے نت نئے فیشن ٹرینڈ کا حصہ بن رہے تھے۔ وہ باغی نہیں تھیں، لیکن وہ نارمل بھی نہیں تھیں۔ ہر عقل مند، ہوش مند، سمجھدار اسٹوڈنٹ انہیں دیکھ کر منہ بنالیتا تھا۔ وہ سب عقل سے عاری، سمجھ بوجھ سے بہری، کام کی باتوں سے گونگی تھیں۔ چلتی پھرتیں فیشن کی دکانیں تھیں۔ کبھی کبھی ان کا دل چاہتا تھا کہ پلاسٹک کی ان گڑیوں کے ہاتھ، پیر، گردن، سب الگ الگ کر کے انہیں ڈس بین میں پھینک دیں۔ اور اس ڈس بن کا کوڑا ''بہر مردار'' میں پھنکوا دیں۔ ہر یونیورسٹی، کالج، اسکول میں ایک ایسا گروپ ضرور ہوتا ہے جس کی حرکتوں سے سارا سسٹم ڈسٹرب رہتا ہے۔ وہ گروپ چھچھورا، نالائق، نکما، اور بھونڈا ہوتا ہے......

ان کا گروپ وہی گروپ تھا۔ حدی اس گروپ کی لیڈر تھی۔ وہ عام نہیں تھی۔ اسی لیے بہت خاص لائف گزار رہی تھی۔ دولت کمانا شاید مشکل ہوتا ہوگا، لیکن اس اجاڑنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایک دماغ سے عاری جسم...... ایک حسوں سے عاری بے حسی کا سسٹم......بس......سب تباہ......دولت ہو یا زندگی......وقت ہو یا مقصد......

وہ پوز مار کر نہیں تھکی تھیں، انہیں پوز مارتے دیکھ کر باقی کے اسٹوڈنٹس تھک گئے تھے۔ ان کا فوٹو شوٹ مکمل ہوا تو انہوں نے چند کلاس فیلوز کو بھی اس قابل سمجھا تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک فوٹو لے لیں۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے کوٹ اور کیپ پہن لیں۔ کانوکیشن تقریب شروع ہو چکی تھی۔ انہیں ڈگری، تقریروں، ڈین، پروفیسرز، فیوچر کی پلاننگ وغیرہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بھلا...... وہ جمائیاں لے رہی تھیں۔

''یو آر اسٹار آف واڈے......''

اس نے ایک کلاس فیلو کے ساتھ سیلفی لی تو اس نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا۔ اسے بھی مسکرانا پڑا۔ کوشش کے باوجود اس کی کسی اور کلاس فیلوز سے دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بد اخلاق نہیں تھی، لیکن اگر کوئی اپنے پیسے کی اتنی زیادہ نمائش کرتا پھرے گا تو پھر وہ بد اخلاق ہو یا نہ ہو، مغرور ضرور مشہور ہو جائے گا۔ اگر عام انسانوں کے قریب ہوتا ہے تو ان جیسا ہوتا ہوگا...... ان جیسا عام...... دنیا میں عام لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، جو واقعی میں خاص ہوتے ہیں وہ دوسروں جیسا عام بن کر رہتے ہیں۔ وہ اپنے اندر یہ عظمت پیدا کر لیتی، اگر اسے ضرورت محسوس ہوتی...... اس نے کبھی کسی ٹیچر، پروفیسر سے بدتمیزی نہیں کی تھی، لیکن اس کے فیس پر ''ڈونٹ یو ڈیئر ٹو'' (مجھ چھیڑنے کی جرات نہ کرنا)'' اتنا واضح لکھا ہوا ہوتا تھا کہ وہ خاموش بھی رہتی تھی تو لگتا تھا بدتمیزی کر رہی ہے۔

انہیں ڈگریاں مل گئیں۔ ماما پاپا تقریب اٹینڈ کر کے، اسے گلے سے لگا کر جا چکے تھے۔ اب وہ سب سیڑھیوں پر اوپر نیچے کھڑے تھے۔ یونیورسٹی کی بلند عمارت ان کی پشت پر تھی۔ ان کے سامنے ایک، دو، تین نہیں، پورے تیرہ فوٹو گرافرز اپنے کیمرے اسٹینڈ اسٹکس پر ٹکا

Sumaira Hameed:Author

کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ حدی کا ہی کمال تھا کہ اس نے کانوکیشن تقریب کو 'فٹ بال ورلڈ کپ فائنل'' کی شکل دے دی تھی۔ اور شہر کے ناپ اور مہنگے فوٹو گرافرز کو کلاس اور پروفیسرز کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا انہوں نے ڈگریاں نہیں لیں فرانس کو ہرا کر، برازیل کو کِک مار کر، فیفا ورلڈ کپ ٹرافی جیت لی ہے۔ فوٹو گرافرز انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ ساری کلاس، پروفیسرز سمیت شرافت سے ان کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ گلے میں گولڈ میڈل پہنے پروفیسر کے ساتھ کھڑا لائم اس ساری صورتحال پر چھوٹا سا قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''ایسے لوگوں کی وجہ سے دنیا میں رونق رہتی ہے ویسے...... ''اس نے اپنے دوست کے کان میں کہا۔ وہ حدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''خالی خولی رونق؟ نہیں میرے دوست...... تماشے...... ڈرامے...... ہنگامے...... مضحکہ خیزیاں کہو۔ یہ نہ ہوں تو ہم جیسے لوگ پڑھ پڑھ کر سٹھیا جائیں اور ہمیں مسکرانے کے لیے کوئی وجہ نہ ملے......''

''ہائی واوے...... لگتی بہت پیاری ہے یہ......''

''نظریں پھیر لو میرے دوست۔ فوراً نظریں پھیر لو...... تم اس پر ذرا سا بھی کرش افورڈ نہیں کر سکتے۔ اپنی اوقات سے باہر چیزوں کو خوبصورت نہ کہو، ورنہ تمہاری زندگی خوف صورت جہنم بن جائے گی۔ تم نے اس کے قدموں میں جان بھی دے دی تو بھی یہ تمہیں گھاس نہیں ڈالے گی۔ یہ جو گلے میں گولڈ میڈل پہنا ہے اس کا کچھ خیال کرو، اور حدی کے خیال کو دل سے اتار پھینکو۔''

لائم نے قہقہہ لگایا۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔ حدی نے گردن موڑ کر اسے گھور کر دیکھا تو وہ اسے ایک آنکھ مارے بغیر نہیں رہ سکا۔

''یو آر اسٹار آف مائی لائف...... مائی چائلڈ......'' ہونٹوں سے پچکارا بھی۔

اسٹار آف ہز لائف نے نفرت سے نظریں پھیر لیں۔ وہ مزید اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اسٹینڈ بائی...... میں تھری کہوں تو سب اپنی ٹوپیاں اچھالیں۔ آپ کی مسکراہٹیں نمایاں اور دلکش ہوں......'' ہیڈ فوٹو گرافر نے انہیں ہدایات دیں۔ وہ وہی سرکس مین لگ رہا تھا، جو چھوٹی سی اسٹک لہرا لہرا کر جانوروں کو ہدایات دیتا ہے۔

''ٹھیک ہے جناب......'' فرمانبردار بچوں کی طرح، کچھ حدی کو چڑانے کے لیے، کچھ ماحول سے محظوظ ہوتے ہوئے سب نے ایک ساتھ گردنیں اوپر نیچے کر کے کہا۔ فوٹو گرافر ہنس دیے۔ لائم کا قہقہہ ذرا بلند تھا۔

''ون...... ٹو......'' ہاتھ اٹھا کر، دو انگلیاں کھڑی کرتے ہوئے فوٹو گرافر نے کہا۔

اور تھری پر ساری کلاس نے 'پوری یونیورسٹی نے...... ساری دنیا نے اپنی ٹوپیاں اچھال دیں...... نیلے آسمان کے نیچے، روشن دن کی آغوش میں...... وہ خود بھی اچھلے...... حدی نے بھی اپنی ٹوپی اچھالی...... اس کا سر اوپر اٹھا، نظر آسمان تک گئی...... اور وہ نظر آسمان تک ہی رہ گئی...... خود وہ لہرا کر لڑکھڑائی...... اوپر سے نیچے گری...... تیسری سے دوسری اور پھر پہلی سیڑھی تک آئی......

وہ ایسے ایکدم سے گری کہ سب اپنا آپ بھول کر جلدی سے اس کی طرف لپکے۔ جوشیلے نعرے، صدماتی چیخوں میں بدل گئے۔ اس کی کیپ دور جا گری تھی۔ اس کا سر زمین سے جا ٹکرایا تھا۔ خون کی ایک پتلی لکیر اس کی پیشانی سے نکل کر سفید گال پر نشان

Sumaira Hameed:Author

چھوڑنے لگی تھی۔اس نے آسمان کی چھت کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں......

یہ آنکھیں کھلیں گی تو وہ جان جائے گی...... جان جائے گی کہ اب کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا...... نہ دنیا' نہ لوگ' نہ وہ خود اور نہ ہی......زندگی......

زندگی کی سانسوں کی تعداد مقرر ہوئی...... زندگی نے ہمیشہ ''ساتھ'' رہنے کا وعدہ عین بہار توڑ دیا......

ایک بیماری نے سب کچھ بدل دیا...... زندگی نے اس کے پیروں تلے سے مخملی قالین کھینچ لیا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی۔اس نے ساری کلاس کے ساتھ اپنا فوٹو شوٹ مکمل کروا لیا تھا۔ٹوپی کو پھر سے اچھال دیا تھا۔فرق تھا تو بس اتنا کہ اس کی پیشانی پر ایک عدد بینڈ ایج لگی ہوئی تھی۔اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔اپنی ساری خوبصورتی کے ساتھ وہ تھوڑی سی مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔اسے ساری کلاس، سارے جہاں کی نظر لگ گئی تھی۔

''کلاس کے مجھ جیسے غریب غربا ابن بڈزل کر تم جیسے شریف لوگوں کو لنچ پر بلا رہے ہیں۔ہمیں شرف ملاقات بخشیں گی؟'' دو دن بعد اسے ائم کی کال آئی تھی۔

اسے ہنسی آ گئی، نجانے کیسے۔''ہم سب فرینڈز کو بلا رہے ہو......؟؟''

''بالکل! میرے دادا کنٹری سائیڈ رہتے ہیں۔قصبے والوں کو کہنا ہے کہ عرصہ ہوا انہوں نے سرکس نہیں دیکھی......تو......''

اس نے دانت تو پیسے لیکن فون نہیں پٹخا۔''اپنے دادا کو تم نے کبھی اپنا تماشا نہیں دکھایا؟؟''

''دکھایا تھا، کہنے لگے، بندروں کا تماشا دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں، اب......

''خبردار جو تم نے مجھے لومڑی کہا......'' وہ چلا اٹھی۔

''پر میں تو تمہیں پری کہنے والا تھا......'' اس نے سنجیدگی سے کہا......لیکن پھر قہقہہ لگا دیا۔

ائم کے دادا کا قصبہ، قصبے کا جنگل اور جنگل کا ماحول اچھا تھا۔وہ سب مل کر لکڑیوں پر کھانا پکاتے رہے۔ائم نے اس کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی۔''جسٹ فار آ چینج'' وہ اس کے بلانے پر چلی گئی تھی اور اس تبدیلی کو پسند کر رہی تھی۔شام کے سائے پھیل رہے تھے جس وقت وہ گیارہ لوگ جنگل میں دوڑ لگا رہے تھے۔وہ ایسی پیچھے بھی نہیں تھی اور زیادہ آگے بھی نہیں تھی لیکن جب وہ گھاٹی سے گری تو اس کا رول ہوتا جسم آگے نکل جانے والوں سے بھی آگے نکل گیا۔

وہ پھر سے بے ہوش ہو چکی تھی......

اسے ہوش آیا تو سب اسے فکرمندی سے دیکھ رہے تھے۔اس نے مسکرانے کی کوشش کی......

''میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا جسم آف ہو کر آن ہوا ہے۔جیسے جلتے چراغ پر کسی نے پھونک مار دی تھی۔

''نہیں......تمہارا پاؤں نہیں پھسلا تھا۔تم نے اپنا توازن کھو دیا تھا۔تم نے کیا محسوس کیا تھا؟'' ائم نے فکرمندی سے پوچھا۔

Sumaira Hameed:Author

''میرا پاؤں ہی پھسلا تھا.....'' اسے یاد ہی نہیں تھا کہ اس نے کیا محسوس کیا تھا..... اندھیرہ..... بس.....

گھر واپسی پر وہ ڈرائیو وے میں کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے گر گئی تھی۔ ماما لپک کر اس کی طرف آئیں۔ وہ ماما پاپا تینوں سال میں دو بار اپنا میڈیکل چیک اپ کرواتے تھے۔ ابھی تین مہینے پہلے اس کا مکمل میڈیکل چیک اپ ہوا تھا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے جسم میں کوئی معمولی سی بیماری بھی ہوتی اور اسے معلوم نہ ہوتا۔ ماما نے کہا کہ وہ پھر سے ایک بار چیک اپ کروا لے تو اس نے شانے اچکا کر بے زاری سے کہا۔

''میں بورا بورا جا رہی ہوں..... اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔''

''پھر ایک لائٹ چیک اپ کے لیے میرے ساتھ چلو۔ ایک بار ڈاکٹر سے مل لو۔''

''ڈاکٹر سے آپ جا کر مل لیں، میرا ہائے کہہ دیجئے گا.....''

''حدی..... یہ لاپرواہی ہے.....''

''ماما! یہ بے جا پابندی ہے۔ مجھے نفرت ہے ڈاکٹروں کی شکلوں سے۔ ہنستے بھی ہیں تو ایسا لگتا ہے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''تمہارے فیس پر ایک پمپل بھی نکل آئے تو تم انہی مذاق اڑانے والے ڈاکٹروں کے پاس بھاگتی ہو۔''

''پمپل نکلا تو چلی جاؤں گی..... ڈن.....'' اس نے ماں کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

بورا بورا جانے سے پہلے، گروپ کی فرینڈ کی پارٹی میں، اپنے اپنے گلاس اٹھا کر چیئرز کہتے، اس کا دماغ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ لہرائی اور اپنے ہاتھ سے گر کر ٹوٹے گلاس کی کرچیوں پر ڈھیر ہو گئی۔ اس بار اسے فوراً ہوش نہیں آیا تھا۔ اس بار وہ ابتدائی طبی امداد پر اٹھ کر کھڑی نہیں ہو گئی تھی.....

اس بار اسے سولہ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر تھی۔ اسے لگا کہ وہ کئی سال سوتی رہی ہے۔ اب جاگی ہے تو کسی اور کے جسم میں جاگی ہے..... اس کے جسم کی زبان بدل چکی تھی.....

ماما پاپا دونوں اس کے بیڈ کے قریب چیئرز گھسیٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی ماں کو کبھی رونے کی ضرورت درپیش نہیں رہی تھی' اب کہیں وہ روتی رہی تھی تو بہت عجیب لگ رہی تھی۔ اس کی پہلی نظر ماں پر ہی اٹھی تھی۔ پہلی نظر نے ہی اسے چونکا دیا تھا۔ ماں سے اس اندوہناکی کی وجہ پوچھنے کے لیے اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تھی.....

''حدی! میری حدی.....'' اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ جلدی سے لپک کر اس کے قریب آ گئیں۔ سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ یہ انہوں نے کس انداز میں 'میری حدی' کہا تھا۔ پاپا کو کھڑا ہونے میں وقت لگا تھا۔ ان کا کپکپاتا ہوا ہاتھ حدی کے ہاتھ پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ بہت کچھ کہنے کی کیفیت میں، وہ کچھ بول ہی نہیں سکے۔ دونوں کے انداز و اطوار بدلے ہوئے تھے۔ دونوں نے شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ وہ کالج' یونیورسٹی کی ایوریج اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اس نے کبھی اچھے مارکس نہیں لیے تھے۔ کتابیں اسے پسند نہیں تھیں۔ ذہانت سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی ماں باپ کے انداز نے اس کی ساری حسیں جگا دی

Sumaira Hameed:Author

تھیں ......وہ پوری کی پوری بیدار ہوگئی تھی ......زندگی ......یہ تو ایک جھٹکے میں سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

جو عورت رات کو بھی لپ گلوز لگا کر سوتی تھی، وہ اب بے رنگ ہونٹوں، مرجھائے چہرے، روئی روئی آنکھوں کے ساتھ میک اپ سے عاری کھڑی تھی ......کیوں؟ اس کی آنکھیں ایکدم سے بھر آئیں۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ماں سے بڑی آس سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں ناماما! مجھے کچھ ہوا تو نہیں؟ برین ٹیومر؟؟ یا ......یا ......؟؟''

کھڑکی سے نظر آتا شام کا آسمان، اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ ماں سسکتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ ادھ کھلا دروازہ اس کے چہرے سے زندگی کے رنگ نچوڑنے لگا۔ پاپا نے اس کا ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اسے چوما۔ پھر وہ جھک کر اس کی پیشانی چومنے لگے، اس کے گال، اس کا سر ......اس کا چہرہ باپ کے آنسوؤں سے بھیگنے لگا ......

''مجھے برین ٹیومر ہے ......؟؟'' اس نے پاپا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سختی سے دبایا۔

''نہیں ......'' بہت دیر بعد وہ جواب دے پائے۔ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ وہ باپ کی آنکھوں میں بے پناہ محبت اور تکلیف دیکھ رہی تھی ......باپ اس کی آنکھوں میں ''اپنی'' دم توڑتی ہوئی زندگی دیکھ رہا تھا ......

''نہیں ......؟؟'' وہ ایکدم سے ہنس دی۔ ''اوہ پاپا! آپ دونوں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اب بس بتا دیں مجھے۔ کیونکہ مجھے برین ٹیومر اور ایڈز سے ڈر لگتا ہے ......بس ......''

''کینسر ......'' پاپا نے ایکدم سے کہہ دیا۔ وہ اس کی طرف سے اپنا رخ پھیر چکے تھے۔ وہ اپنی آنکھیں رگڑ رہے تھے۔

''کینسر ......'' اس نے زیر لب دہرایا ......''کون سی اسٹیج ہے؟؟'' اس نے بہت بہادر بنتے ہوئے پوچھا۔ وہ بالکل نارمل تھی۔

اس کے ایسے نارمل لہجے پر وہ ایک دم سے اس کی سمت واپس مڑے۔ وہ جانچ رہے تھے کہ وہ اتنی نارمل کیوں ہے۔ کس لیے؟

''بتائیں ناپاپا! کینسر تو قابل علاج ہے۔ اِٹس اوکے یار پاپا! مجھے اس بیماری سے ڈر نہیں لگتا۔ میں اس بیماری کو ہرا دوں گی۔ ڈونٹ وری! ٹرسٹ می ......میں فائٹ بیک کروں گی ......'' اس کی انرجی لوٹ آئی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش ہونے لگا تھا۔

وہ یک ٹک اسے دیکھتے رہے ......آنسوؤں کی زیادتی اس کی صورت کو دھندلا رہی تھی ......

''ایسے رو کر مجھے کمزور نہ کریں۔ بتائیں ناپاپا! کیسا کینسر ہے؟ کون سی اسٹیج ہے؟''

''سا......سات ......ان کا کہنا ہے کہ بس چھ سات مہینے ......'' وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کمرے سے نکل کر روتی ماں کی آواز، اندر روتے باپ کی آواز سے آملی ......

وہ اپنی ہتھیلی پر لگی ڈرپ کی پن سیٹ کر رہی تھی اور وہ ہاتھ وہیں رک گیا۔ سارا جہاں رک گیا ......وہ کینسر سے نہیں ڈرتی تھی، لیکن اب ایکدم سے زندگی کے ختم ہو جانے نے اسے ڈرا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا۔ سات مہینوں نے انہیں ستر سال کا بنا دیا تھا۔ اس نے آدھ کھلے دروازے کی طرف پھر سے دیکھا۔ یہاں سے وہاں بھاگ کر ایک ستر سال کی بوڑھی عورت گئی تھی ......اس کی ماں ......وہ پچھلے سولہ گھنٹوں سے اس کی موت کا سوگ مناتے رہے تھے۔ وہ زندہ بیڈ پر پڑی تھی اور وہ اس کی موت پر روتے رہے تھے۔

Sumaira Hameed:Author

زندگی کی ایک گھڑی ہوتی ہے جو ہر انسان کے اندر چھپ کر ٹک ٹک کرتی ہے۔ کچھ کو وہ آواز سنائی دیتی ہے اور کچھ کو اپنا احساس بھی نہیں دلا پاتی۔ اسے ایک لمحے کے لیے اس ٹک ٹک کی آواز سنائی دی ...... ایسی ٹک ٹک جو ختم ہونے جا رہی تھی ......

''سات مہینے ......'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ خون اس کے جسم میں اتنی روانی سے دوڑا کہ اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ اسی لیے اس کے جسم نے اپنی زبان بدل لی تھی۔ ایسی زبان جو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''سات مہینے ......'' صرف یہ فقرہ سنائی دے رہا تھا۔

زندگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں لگتی ...... وہ سات مہینوں بعد ختم ہو جائے گی ......

موت جو کہیں سے بھی آتی ہوئی نظر نہیں آتی ...... وہ سات مہینوں بعد سامنے کھڑی ملے گی ......

''میں ایک تیز گام ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میں اپنے خوابوں، منصوبوں، جوشیلے جذبوں اور مقاصد کے ساتھ پوری طرح مصروف تھا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔''

''آپ کا اسٹیشن آ چکا ہے، برائے مہربانی اتر جائیے ......'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ٹرین کا ٹی سی مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''نا ...... نہیں ...... ابھی میرا اسٹیشن نہیں آ سکتا۔ میری منزل تو ابھی آنی ہے۔'' بے یقینی سے ٹی سی کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے جھٹلانا چاہا۔ (عرفان خان۔ کینسر فائٹر)

زندگی کی ٹرین کسی بھی اسٹیشن پر اتار سکتی ...... زندگی نے ہمیں ہمیشہ اپنا مسافر بنا کر بٹھائے رکھنے کا وعدہ ہی کب کیا تھا بھلا؟

☆ ...... ☆ ...... ☆

سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن پھر بھی سائنس ''زندگی'' کی زندگی پر قادر نہیں ہے۔ یہ درد سے نجات دے سکتی ہے' مردے کو زندگی نہیں۔ اس دنیا کی ساری ترقی' یہ تو بس سہولت ہے ...... آسائش ہے ...... دھوکا ہے ......

اس کا بچپن سے لے کر اب تک کا سارا میڈیکل ریکارڈ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ سال میں دو بار چیک اپ کروانے پر بھی اس بیماری نے اپنا پتا نہیں دیا تھا۔ ان کے گھر میں کک کے ساتھ ایک نیوٹریشن تھی وہ کچے پکے ہر فوڈ کی جانچ پڑتال کرتی تھی۔ وہ ان تینوں کو ان کی عمر، جسمانی ساخت کے مطابق کھانا دیتی تھی۔ وہ صرف اورگینک فوڈ کھاتے تھے جو اورگینک فارم ہاؤسز سے سیدھا ان کے گھر آتا تھا۔ انہوں نے صحت کے معاملے میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ ماما پاپا دونوں اتنے فٹ اور ینگ تھے کہ وہ اسکول جانے والے بچوں کے ماں باپ تو لگتے تھے لیکن بائیس سال کی لڑکی کے نہیں۔ خود وہ بیوٹی فریک تھی۔ اپنی خوب صورت اسکن کے لیے وہ جنک فوڈ اور مصنوعی ڈرنکس سے دور رہتی تھی۔ جم، اسپورٹس، یوگا، سوئمنگ، جسم کو فٹ رکھنے والی ہر طرح کی ہر ایکٹیویٹی اس کی زندگی کا حصہ رہی تھی۔

پھر ...... پھر یہ بیماری اسے کیوں ہوئی ...... کیسے ہوئی ......؟؟

اس نے اپنی ٹریٹمنٹ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ماما پاپا کے ساتھ گھر آتے ہوئے' کھڑکی سے باہر کی دنیا کو دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے اب وہ اس دنیا کا حصہ نہیں رہی ہے۔ یہ دنیا سب کی ہے لیکن اس کی نہیں ہے۔ فٹ پاتھ پر پرام لے کر چلتی ماں' دوڑ کر سڑک کراس

Sumaira Hameed:Author

کرتے تین ایجرز ٹیکسی کی بیک سیٹ پر بیٹھی ، مڑ مڑ کر دیکھ کر لپ اسٹک لگاتی لڑکی۔ یہ سب لوگ .... یہ سارا منظر .... یہ کس دنیا کا تھا ...... اس کی دنیا کا نہیں تھا ......

سر کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے گھر کو اس نے باہر کی دنیا سے زیادہ اجنبی پایا۔ جس گھر میں وہ بائیس سال رہتی رہی تھی، وہ گھر کہیں کھو گیا تھا۔ اب یہ تو کوئی اور ہی جگہ تھی۔ ڈرائیو وے میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے عالیشان گھر کو، اس کی بلندی تک دیکھا .... دور اوپر تک .... سورج کی روشنی شیشے کی دیواروں پر چمک چھوڑ رہی تھی۔ کرنوں سے اس کی آنکھیں چندھا رہی تھی۔ اطراف بچھا سبزا، کتنا بے رنگ تھا .... کیسا عجیب رنگ تھا .... ماما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر متوجہ کیا تو اس نے حیران ہو کر اس عورت کو بھی دیکھا۔ ساری دنیا کی طرح اسے وہ دونوں بھی خود سے الگ لگے .... اجنبی اور بے رحم ....

اس نے دنیا کی ہر چیز، ہر منظر کو اجنبی پایا .... اس نے اپنے سوا دنیا کی ہر شے کو ضروری اور متحرک پایا۔

''جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کینسر ہے تو میں نے زندگی سے بڑھ کر کسی شے کو قیمتی نہیں پایا۔ اس کے علاوہ میں نے ہر دوسری قیمتی چیز کو بے جچ اور فضول پایا ......'' (علی بنت)

زندگی سے منور آپ کی آنکھ، جو یہ سطر پڑھ رہی ہے، وہ باقی جسم سے بس اتنا کہہ دے۔ ''اپنی زندگی اور تندرستی کی قدر کیجئے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

ساری دنیا ایک ہی زبان بول رہی تھی۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر، دنیا کا بڑے سے بڑا ہاسپٹل، میٹنگ کے لیے بٹھایا ڈاکٹرز کا ہر بورڈ، ہر مشین، ہر رپورٹ، سائنس کی ہر کتاب، ہر دوا .... کوئی نو مہینے کی بات کر رہا تھا .... کوئی چار کی .... کوئی پانچ اور کوئی سات کی۔ کوئی بھی ''زندگی'' کی بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ سب سائنس، تھیوری، فیکٹس، کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ وہ اپنی زبان کیسے بدل لیتے۔ وہ آسٹریلیا گئی، پندرہ دن تک ٹیسٹ کرواتی رہی، رزلٹ وہی تھا جو امریکا کے ہاسپٹل کا تھا۔

سارا جہاں ایک جیسا تھا .... ناکارہ، بے کار .... سائنس نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ اس نے بس لوہے کو جہاز بنا کر اڑایا ہے۔ مٹی کو اینٹ، اینٹ کو عمارت .... بس .... روشنی کو رفتار کیا ہے۔ رفتار کو قابو .... اور سائنس نے کیا ہی کیا ہے۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ جو میک اپ کمپنیوں کو فون کر کے اپنی پسند کے میک اپ شیڈ بنوا لیتی تھی تو سب کتنا آسان تھا۔ signature بیگ، ڈریسز، کاریں، گھر، حتی کہ جسمانی اعضا تک پا لینا۔ دنیا کی ہر چیز ایک فون کال پر اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ کتنا آسان تھا ہر چیز کو اپنے لیے خاص کر لینا۔ اس کی کوئی ایک بھی خواہش ایسی نہیں تھی جس کی تکمیل سائنس نہ کر سکتی ہو۔ پھر سائنس .... یہ اس کی زندگی کو موت کے منہ میں جانے سے روک کیوں نہیں پا رہی تھی ....

اس کی فرینڈز اور یونیورسٹی سرکل میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ پیغامات کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ وہ تینوں فارم ہاؤس شفٹ ہو چکے تھے۔ فون وہ بند کر چکی تھی۔ یہ وہی فون تھا جو ہر وقت اس کی دس انگلیوں کے درمیان رہا کرتا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، فون کو خود سے جدا نہیں دیکھا تھا۔ اب یہ فون پچھلے پندرہ دنوں سے بند تھا۔ انسٹا گرام پر کوئی اسٹوری شیئر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے کروڑوں

Sumaira Hameed:Author

فینز پریشان تھے کہ وہ کہاں غائب ہے۔لاکھوں لائیکر (لائیک کرنے والے) ہزاروں کمنٹر فکرمند تھے کہ وہ اتنی خاموش کیوں ہے۔مشہور ولاگرتک نے اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا۔ویکلی میگزین میں اس کی گمشدگی کی نیوز آئی تھی۔کچھ فین میمز بنے، بہت سی افواہیں اڑیں...... بہت کچھ ہوا......

ایک لمحہ لگا تھا اور ہر چیز بے معنی ہو گئی تھی۔کروڑوں فینز' لاکھوں کمنٹس' ٹرینڈنگ پوسٹس، اس کی نیوز میکر حرکتیں، ٹرینڈ سیٹنگ فیشن۔ان سب کی حیثیت ایک لمحہ تھی تو اس نے اب تک کی اپنی زندگی ان پر ضائع کیوں کر دی تھی...... ان سب کی قیمت ''کوئی قیمت نہیں'' تھی تو اس نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت ''قیمت میں ادا کیوں کیا تھا''؟؟؟

جھیل کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے وہ پانی میں تیرتے جانوروں کو دیکھ رہی تھی۔اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس جانور کیا کیا نام ہے۔وہی جانور جو سفید سا ہوتا ہے...... جو خاموشی میں درویش لگتا ہے...... چہکار میں فرشتہ...... اور مستی میں ''محبت'' لگتا ہے۔

''سوان (ہنس)......'' اس کے کان میں سرگوشی نہیں ہوئی تھی...... کلام ہوا تھا...... وہ بول رہا تھا......

''ہر زمانے میں پرندوں نے اپنی علامتیں بدلی ہیں۔محبت...... یہ اس زمانے کی علامت ہے۔محبت جو انسان کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔''خود سے محبت۔'' اس نے کہا، جس کے الفاظ احساس کی طرح اس کے دل پر اترے تھے۔جیسے ہوا، جو جسم کو چھوتی ہے۔جیسے روشنی جو بس موجود ہوتی ہے۔جیسے فرشتے جو بہت قریب رہتے ہیں اور بغیر لفظوں کے کلام کرتے ہیں۔

اس نے بھی یہی کلام سنا تھا...... بغیر الفاظ کے...... بہت قریب سے......

☆ ...... ☆ ...... ☆

بیس دن بعد اس نے دنیا بھر کے ڈاکٹرز کا کہنا قبول کر لیا تھا۔اپنی رپورٹس، اپنا کینسر اور مختصر ہو چکی اپنی زندگی۔وہ صدمے کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔اس نے مان لیا تھا کہ اس کی زندگی بس اتنی ہی تھی۔بس! یہ سب ایسے ہی ہونا تھا۔وہ اپنی ماں کے پاس آئی اور ان کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں......

''میں اپنی مرضی سے وقت گزارنا چاہتی ہوں...... مجھے جانے دیں۔''

''تم جہاں بھی جاؤ گی ہم تمہارے ساتھ جائیں گے...... بس...... اس کے علاوہ کوئی ڈیل نہیں ہو گی۔''

پاپا اس کی بیماری کے بعد سے سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔وہ ایک بھی دن آفس نہیں گئے تھے۔ان کا ملین ڈالرز کا کنسٹرکشن کا بزنس جو ان کی سانس سے بندھا رہا کرتا تھا، اب اکیلا ہی ہچکیاں لے رہا تھا۔

''مجھے مریضوں کی طرح ٹریٹ کرنا بند کر دیں پلیز! مجھے نارمل لائف گزارنے دیں۔میں آپ کو اپنا سایہ نہیں بنا سکتی۔''

پاپا نے ماما کی طرف دیکھا۔کتنا مشکل تھا اسے یہ سمجھانا کہ اس سے زیادہ تکلیف میں تو وہ خود ہیں۔اب وہ کہاں گھوم پھر کر اپنی تکلیف رفع کریں...... کیسے chill کریں......

''پھر بھی ہدی!'' ماما نے لہجے کو نارمل رکھنا چاہا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی اب وہ عام بات بھی کرتی تھیں تو لگتا تھا رو دیں گی۔صبح وہ

Sumaira Hameed:Author

کک سے ناشتہ بنانے کے لیے کہتے کہتے پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

''اب مجھے پتا چلا کہ اصل خوش قسمت کون ہوتا ہے۔'' ناشتے کی میز پر سر رکھ کر وہ ہچکیاں لینے لگیں۔

''مجھے لگتا تھا میں دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں۔ اب اپنے سوا مجھے ہر انسان خوش قسمت لگتا ہے۔ جیسے کہ تم...... جیسے کہ گھاس کاٹنے والا...... جیسا کہ فوڈ ڈلیوری والا۔ پٹرول پمپ پر کھڑا لڑکا، نیوز پیپر کے اسٹال پر بیٹھی بوڑھی عورت۔ کاش میں وہ عورت ہوتی جو ہفتے میں بیس بائیس ڈالر کماتی ہے، اچھے گھر اور خوبصورت لباس کے خواب دیکھتی ہے۔ یا جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگتی ہے۔ یا وہ جو بستر پر بیمار پڑی ہے، اور اپنی زندگی کے دن گن رہی ہے۔ لیکن جو میری طرح بیٹی کی زندگی کے دنوں کو گننے میں مصروف نہیں ہے۔ میری بیٹی...... میری ھدیٰ...... دنیا کا ہر غم بڑا ہے، لیکن اولاد کا غم سب سے بڑا ہے...... کسی کو یہ غم نہ ملے......''

وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کا اپنا تعلق قطر سے تھا۔ شوہر پاکستانی نژاد امریکن تھے۔ ان دونوں کے خاندان تیس چالیس سالوں سے امریکا میں آباد تھے۔

''میں ہر صورت آپ کے بغیر جانا چاہتی ہوں......'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ اس کی ضدی طبیعت واپس لوٹ آئی تھی۔

لیونگ روم میں سناٹا تھا...... وہی سناٹا جو ان کی زندگیوں میں سانس کی جگہ لے چکا تھا......

بورا بورا......

وہ زندگی کے کچھ سانس یہاں لینا چاہتی تھی......

اپنے دونوں جوتوں اور ٹریولنگ بیگ کی تصویر اس نے انسٹا پر شیئر کر دی تھی۔ ایک ہی تصویر سے انسٹا پر طوفان آ گیا تھا۔ لیکن اس طوفان نے بھی بورا بورا آئرلینڈ کو ویران ہی رکھا تھا۔ وہ ساحل کنارے سجائے گئے ڈنر ٹیبل پر اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر لکڑیوں کا الاؤ دہک رہا تھا۔ جس کے گرد لڑکے لڑکیوں کا گروپ، مقامی ثقافت کے رنگ میں، اپنے سازوں کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ یہ سب اہتمام اس کے لیے کیا گیا تھا۔ اس سے کچھ پہلے ساحل کی پٹی پر 'ھدیٰ' نام کے بڑے بڑے انگلش حجے آتش گیر مواد سے جلتے رہے تھے...... بورا بورا اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا......

دور تک پھیلا رات کا سمندر، اس میں جھلمل کرتا رات کے آسمان کا چاند...... رقص کرتے لوگ، ترنم سے بجتے ساز......

دنیا کتنی خوب صورت تھی...... ہر چیز وہی تھی...... ویسی ہی تھی...... پھر بھی...... پھر بھی......

صبح اس نے بلندی سے پانی میں چھلانگ لگائی۔ شفاف سمندر میں وہ آبی جانور کی طرح دور نیچے تک چلی گئی۔ سر باہر نکال کر، جب اس نے نیلے شفاف سمندر کو سطح سے دیکھا تو جانا کہ سمندر بھی اس کا نہیں رہا۔ اس کی نظر سمندر کے پانی پر کائی کی طرح جم گئی......

وہ اگلے ہی دن بورا بورا سے چلی گئی۔ ماں کی دی ہوئی میڈیسن وہ سمندر میں پھینک گئی تھی۔ اس کی فرینڈز نے چپ چاپ اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ بیمار ہے اور ابنارمل بی ہیو کر رہی ہے...... پھر بھی سب صاف ظاہر ہو رہا تھا......

Sumaira Hameed:Author

وہ fashionista تھی۔ ترقی یافتہ دور کی ترقی یافتہ لڑکی۔ اسے لگتا تھا کہ جیسا فلموں میں ہوتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ مرنے والی ہے' اس کے پاس چھ سات مہینے ہیں' وہ ورلڈ ٹور کرے گی' پہاڑوں پر چڑھے گی' دریاؤں اور سمندروں میں نہائے گی' گائے گی، ناچے گی، پوری طرح سے انجوائے کرے گی۔ سات مہینوں میں ستر سال کی زندگی جی کر، بستر پر گر کر دم دے دے گی۔ اسے لگتا تھا وہ ایسا کر لے گی...... اسے لگا ایسا ہو ہی جائے گا...... لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا......

کنگ فو پانڈا دیکھتے ہوئے وہ مسکرا نہیں سکی۔ آئسکریم سٹی ٹوکیو میں آئسکریم کھاتے ہوئے، اس میں ایک اور کپ آئسکریم کھانے کی حسرت دم توڑ گئی۔ فرینڈز کی نظر بچا کر اپنی آئسکریم ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ یونیورسل اسٹوڈیو میں ریونج آف دی ممی رائڈ اسے بوگس اور بے کار لگا۔ وہ خاموشی سے چیخنے چلانے والوں کو دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ نہیں سکی کہ ان کے خوف اور جوش کی وجہ کیا ہے۔

زندگی کے فتیلے پر آگ لگ چکی ہو' تو کسی بات پر ہنسی نہیں آتی۔ شہد ہو یا شیرنی، ہر ذائقہ کڑوا لگتا ہے۔ دنیا کی کوئی جگہ خوبصورت نہیں لگتی۔ اس ساری دنیا کی خوبصورتی ''زندگی'' کے ہونے سے ہے۔ اگر زندگی ہی نہیں ہوگی تو دنیا کی رنگینیاں کیا کمال دکھا سکیں گی؟

ایفل ٹاور کی نوک میں کھڑے ہو کر، سیلفی لیتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر اوپر سے نیچے کی دنیا کی طرف جھانکا۔ وہ ابھی چوبیس سال کی نہیں ہوئی تھی، ایفل کی ٹکٹ اسے ہاف دینی پڑی تھی۔ تو پھر موت اس کی پوری زندگی کی ٹکٹ کیوں کاٹ رہی تھی۔ ایفل اس کی عمر کا لحاظ کر رہا ہے تو موت کیوں نہیں۔ اس نے ٹکٹ چیکر کو اپنا پاسپورٹ دکھایا تو اس نے سر ہلا کر اس کی ٹکٹ ہاف چارج کی تھی۔ وہ موت کے فرشتے کو اپنی عمر بتائے گی تو کیا وہ سر ہلا کر اس پر سے موت کا چارج اٹھا لے گا؟

نیچے کی دنیا بہت رنگین تھی۔ اپنی ہی مستی میں رواں دواں تھی۔ دریا سین اسے بیگانہ لگا لیکن حقیقت میں تو وہ چہلیں کر رہا تھا۔ نیچے کی دنیا، اوپر کے آسمان کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ بہت دور بلندی پر کھڑی ایک لڑکی یہ جان چکی ہے کہ اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے صرف چند مہینے بچے ہیں۔ وہ جان چکی ہے کہ دنیا کی ساری خوبصورتی زندگی کے ہونے سے ہے...... ورنہ تو دنیا بہت بدصورت ہے...... دریا سین گندا ہے...... پیرس منحوس ہے...... اس کی روشنیاں آنکھ کا دھوکا، اس کی رنگینیاں خوابوں کا میل ہیں۔

دو ٹین ایجرز سر سے سر جوڑے سیلفیاں لے رہے تھے، ابھی وہ زندگی کو ایک ہی نام سے جانتے تھے۔ ''خواب'' ہنی مون پر آئے کپل کے قہقہے ہر آواز میں نمایاں تھے۔ اس نے نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں محبت کی پوری چمک دیکھی۔ اس کے گال چومتے، اس کے شوہر کے انداز میں دیوانگی......

اس نے گہرا سانس کھینچ کر منہ پھیر لیا...... ابھی تو اسے محبت کا مزا چکھنا تھا...... ابھی تو...... ابھی تو......

لالی پاپ کھاتی ایک بچی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ بچی کی ہنسی اس کی ہستی کو انگارہ بنا گئی......

شانزے لیزے پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ گھٹنوں تک لانگ شوز اور جینز کی پاکٹ میں دونوں ہاتھ...... کھلے بلونڈ بال اور چہرے پر بے نیازی...... کچھ لوگوں نے اسے پہچان کر ہاتھ سے ہائے کا اشارہ کیا تھا لیکن وہ گردن کو اکڑا اکڑا کر نومی کیمبل کی طرح شاہراہ کو ریمپ سمجھ کر واک کرتی رہی۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔ چہرہ بھینچا ہوا۔ کچھ انگریز ملے، انہوں نے

Sumaira Hameed:Author

اس سے بات کرنی چاہی تو اس نے بے زاری سے ان کے کیمروں پر ہاتھ رکھ کر انہیں پرے کھسکا دیا۔ اس کی فرینڈ ز اس سے کچھ دور، پیچھے چل رہی تھیں۔ وہ رک رک کر کچھ تصویریں بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنی فرینڈ ز سے بھی جدا ہو گئی...... چلتے چلتے، وہ برشے کو پیچھے چھوڑتی گئی...... برشے سے جدا ہوتی گئی...... پیرس سے...... اپنے پیروں تلے کی زمین سے...... کائنات کی برشے سے......

اور اس وقت وہ اتھاہ تنہائی سے جا ملی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ اپنے کمرے سے نکلی تو اس کے سویٹ کے لاونج میں بیٹھیں اس کی فرینڈ ز نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا......'' اس نے شانے اچکا کر بے نیازی سے پوچھا۔

''تم نے شو کے لیے ڈریس کوڈ فالو نہیں کیا......'' تینوں فرینڈ ز نے کچھ بے آرامی محسوس کی۔

وہ ایڑی کے بل ذرا سا گھومی۔ ''کیا برائی ہے اس میں......؟؟ میں ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی ہوں۔''

وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی لیکن وہ فیشن کے سب رولز مایا میٹ کر چکی تھی۔ پرپل تو اس کا کلر ہی نہیں تھا، پھر اس نے پرپل شیفون میکسی پہننے کی غلطی کیوں کی؟ اس پر بلیک ہاف جیکٹ۔ ریڈ کا پی کاوچ، بلیو ہیل، اور گرے ہیٹ...... وہ نو میک اپ لک پسند کرتی تھی، لیکن اس وقت وہ میک تھوپے ہوئے تھی۔ اس نے شارپ ریڈ لپ اسٹک اپلائی کی تھی۔ پرپل شیڈ اس کی آنکھوں کو بوجھل کر رہا تھا......

''کبھی کبھی مضحکہ خیز بھی لگنا چاہیے......''

اس نے ہنس کر بے نیازی سے کہہ دیا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ خود کو رنگوں میں لپیٹنے سے روک نہیں سکی۔ جیسے پرپل اور ریڈ مل کر اس کی بلیک اینڈ وائٹ ہوتی زندگی کو رنگین بنا دیں گے......

ریڈ کارپٹ راہداری سے گزرتے ہوئے فرینڈ ز نے اسے روک کر گروپ سیلفی لینی چاہی تو وہ بے زاری سے اونچی چھت کے اوپیرا ہال کی طرف بڑھ گئی۔ ان سے بہت دور نکل آنے پر، چلتے چلتے وہ رک گئی...... لوگوں کی چہل پہل کا شور، جوش، ولولہ انگیز آوازیں، قہقہے، سرگوشیاں...... اپنی ہیل پر گھوم کر اس نے سب کو دیکھا...... سب کو سنا......

ہر شے بدنما تھی...... ہر آواز کریہہ تھی......

شو شروع ہوا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے سر گھما کر اوپر گیلریوں کی سمت دیکھا۔ اگر وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی تو اس تلاش میں ناکام رہی تھی۔ بت کی طرح ساکت ہو کر وہ اسٹیج کی طرف گھوم گئی۔ کون آیا، کیا گایا، کیا کہا، کیا ایکٹ کیا، کون لڑکی تھی، کون لڑکا تھا، اسے کچھ دکھائی، سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر آواز بھنبھناہٹ تھی۔ ہر ادا نقلی تھی...... ہر شے ازراں تھی

لیکن......

جب ہیروئن نے ہیرو کی موت کا ماتم منانا شروع کیا تو بت بن کر بیٹھے اس کے مجسمے پر ایک ضرب پڑی۔ اس نے اسٹیج کی طرف

Sumaira Hameed:Author

غور سے دیکھنا شروع کیا...... وہ دیکھ رہی تھی...... وہ سن رہی تھی......

سامنے اسٹیج پر وہ خود کھڑی تھی...... وہ اپنی ہی موت کا گیت گا رہی تھی......

اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل آئے۔ پھر یہ آنسو رکے نہیں...... لگاتار بہتے رہے...... اس نے ٹشو نکالنا چاہا تو اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کی شدت نے اس کے ہاتھ سے پاؤچ گرا دیا۔ تھوڑا شور ہوا۔ اس کے پیچھے نشست پر بیٹھے چند لوگوں نے پہلو بدلا۔ اس نے جھک کر لباس کا کونا اٹھایا اور اپنی آنکھوں پر رگڑا...... آنکھ میں لگا گہرا کاجل...... آنکھ پر سجا گہرا شیڈ...... اس کے گالوں پر پانی کے ساتھ کتنی ہی تصویریں بنا گیا۔ ساتھ بیٹھی اس کی فرینڈ نے چونک کر اسے دیکھا۔ باقی دو نے بھی گردن کو جھکا کر اسے دیکھنا چاہا۔

''سورج نیچے آتا ہے تو ستارے اُوپر آجاتے ہیں۔'' (فرنچ مقولہ)

ایکدم سے اس نے اپنے گرد اتنے اندھیرے اکٹھے کر لیے کہ اسے سورج، چاند، ستارے دکھائی دینے بند ہو گئے۔ جھک کر اس نے اپنے پیروں کو جوتوں سے الگ کرنا شروع کیا۔ جسم کے اندر موجود زندگی اپنی سانس کاٹ رہی تھی تو اسے جسم پر موجود ہر چیز تکلیف دے رہی تھی۔ جوتوں کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایسے اوپیرا شو کے درمیان سے اٹھ کر نہیں جا سکتی تھی۔ یہ بداخلاقی بھی تھی اور شو کے قوانین کی خلاف ورزی بھی۔ انتظامیہ کا ایک آدمی جلدی سے اس کی طرف آیا لیکن وہ اپنی نشست کی رو میں کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ لوگوں کو بے آرام کرتی ہوئی وہ کھسکتی جا رہی تھی۔ سسکتی جا رہی تھی...... اوپیرا ہال کے سکوت نے اس کی سسکیوں کو سنا......

آگے سے چند لوگوں نے گردنیں موڑ کر اسے دیکھا...... گیلری میں بیٹھے لوگوں نے گردنوں کو ذرا سا جھکا کر نیچے اسے جھانکا...... سب کی نظریں اٹھی رہ گئی...... انتظامیہ کا آدمی اس کی طرف آتے آتے رُک گیا۔ رنگوں کی تہہ میں بھیگ کر بدنما ہوتے اس کے بدصورت گال سب کو دکھائی دے رہے تھے...... وہ قدم آگے نہیں بڑھا سکی...... ایک بوڑھے میاں بیوی کے درمیان پھنس کر کھڑی تھی...... وہ سسک رہی تھی...... ہچکیاں لے رہی تھی...... اس کی سسکیاں ہر سماعت سن سکتی تھی۔ اسٹیج پر کھڑی فنکارہ ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ اوپیرا ہال میں اس کی سسکیاں گنگنا رہی تھیں...... وہ الگ ہی شو پیش کر رہی تھی......

وہ کیا کر رہی ہے، کہاں کھڑی ہے۔ اس نے ہوش میں آ کر ایک نظر آس پاس دیکھا پھر سر اٹھا کر گیلری میں بیٹھے لوگوں کو۔ اس نے ہر آنکھ کو خود کو دیکھتے پایا...... وہ تیزی سے وہاں سے بھاگ گئی......

اوپیرا ہال سے باہر...... بلندی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے، ریڈ کارپٹ پر دوڑتے ہوئے۔ اسٹیج پر ہیرو کی جدائی کے راگ الاپتی فنکارہ سے دُور...... سڑک پر نکل کر، دریا سین کی طرف، وہ بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ جتنے لوگوں کے قریب سے گزر رہی تھی وہ سب دیکھ سکتے تھے کہ وہ رو رہی ہے...... ہچکیاں لے رہی ہے...... اس کا ہیٹ اُڑ کر گر چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے جوتے اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔ وہ ننگے پاؤں سڑک پر بھاگ رہی تھی......

ابھی تو زندگی شروع ہوئی تھی، وہ ختم کیسے ہو سکتی تھی۔ ابھی تو وہ صرف بائیس سال کی تھی۔ پھر زندگی کی جوان بہاروں پر موت خزاں بن کر کیسے ٹھہر سکتی تھی...... بھاگتے بھاگتے وہ ہانپ کر گھٹنوں کے بل گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

Sumaira Hameed:Author

☆ ...... ☆ ...... ☆

پیرس سے پاپا اسے پرائیوٹ جیٹ میں لائے تھے۔اس میں دو قدم چلنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔اس کی آنکھیں گڑھے بن گئی تھیں۔اس کا رنگ جل کر سیاہ ہونے لگا تھا۔اس کا وزن تیزی سے گرنے لگا تھا۔چھتیس گھنٹوں میں اس نے سات کلو وزن گرا لیا تھا۔اس نے کینسر اور موت کو بیماری بنا لیا تھا۔یہ روگ اس پر پوری طرح سے حاوی ہو چکا تھا۔ اس کی فرینڈز پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے بھاگ کر اسے پیرس کی سڑکوں پر ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔جس سڑک پر وہ گر کر بے ہوش ہوئی تھی،وہاں ہجوم لگ چکا تھا۔اس کی فرینڈز اس کے پاس بیٹھیں زار و قطار رو رہی تھیں۔

اس نے ساری زمین کو سر پر اٹھا لیا تھا......پورے آسمان کو خود پر گرا لیا تھا......

جہاز میں لیٹے ہوئے وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔جیسے اسے سرد تودے سے نکال کر لایا گیا ہو۔اس کی کپکپی دل دہلا رہی تھی۔ماں نے اس کی حالت دیکھی تو وہ اسے گلے سے لگانے کی بجائے اس سے دور ہٹنے لگیں......

''یہ......یہ میری حدی ہے......کیا ہوا اسے؟ کیا کیا ہے اس نے اپنے ساتھ......؟؟'' اپنے بڑے گھر میں انہیں رونے کے لیے بہت کونے ملے،لیکن کوئی ایسا کونا نہیں ملا جہاں انہیں تسلی بھی مل سکتی۔

ڈاکٹرز نے اسے ایڈمٹ کرنا چاہا تو وہ چیخنے چلانے لگی۔وہ ہسٹریائی ہو چکی تھی۔اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر کھینچتی تھی۔اسے جہاں جو چیز نظر آتی تھی اس نے اٹھا کر توڑ دی تھیں۔ہر چیز اس کا مذاق اڑا رہی تھی کہ وہ تو موجود رہنے والی ہے لیکن حدی ختم ہو جانے والی ہے۔اس نے وقت بتانے والی ہر شے ختم کر دی تھی۔گھڑیاں،وال کلاک،موبائل،کیلنڈر......وہ کمرے میں اندھیرہ کر کے رکھتی تھی تاکہ دن اور رات میں فرق ختم ہو جائے۔اس کی بھوک پیاس ختم ہو چکی تھی۔بچا تھا تو بس یہ احساس کہ سب ختم ہو جانے والا ہے......

دونوں ماں باپ اپنی ہمت ہار چکے تھے۔اس نے منہ تک دھونا چھوڑ دیا تھا۔اس کا وزن اتنا گر چکا تھا کہ اس کی گردن کی ہڈیاں نمایاں ہونے لگی تھیں۔اس نے علاج سے انکار کر دیا تھا۔اگر مرنا ہی تھا تو اسے علاج کی تکلیف سہہ کر نہیں مرنا تھا۔وہ زہر کھا لے گی یا نبض کاٹ لے گی۔ پاپا نے بڑے سے بڑے اسکائٹرسٹ سے رابطہ کیا۔دنیا جہاں کے اسکالرز،ذہین و فطین لوگوں نے آ آ کر اسے دنیا جہاں کی دلیلیں دے کر سمجھانا چاہا۔اسے علاج کے لیے مجبور کرنا چاہا لیکن اس نے دونوں کان بند کر لیے۔دونوں آنکھیں میچ لیں۔وہ زندگی کی طرف کھلنے والے دروازے بند کر کے رونے بیٹھ گئی......

''تم کم ہمت ہو......'' بوڑھی اسکائٹرسٹ نے مایوسی سے کہا۔

''کیا با ہمت ہونے سے مجھے زندگی مل جائے گی؟؟''

وہ گھٹنوں کو کھڑا کیے،کاؤچ پر گم صم بیٹھی تھی۔اب وہ کئی کئی گھنٹے اسی حالت میں بیٹھ کر گزار دیتی تھی۔ماما نے ہزار بہانوں سے اسے اس خاتون سے ملنے پر راضی کیا تھا۔وہ دو گھنٹے تک اس کے سامنے بیٹھ کر بولتی رہی تھی......اور مایوس ہوئی تھیں......

کمرے کی دہلیز پر کھڑے ماں باپ کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔زندگی ان کے لیے ایسی کڑی آزمائش بن گئی تھی کہ وہ اپنی جان

Sumaira Hameed:Author

دے کر بھی اپنی بیٹی کی جان نہیں بچا سکتے تھے۔ فیملی کا ایک فرد تکلیف میں ہو تو سب اس تکلیف کو جھیلتے ہیں۔ ماں باپ تو اصل سے کہیں تکلیف سہتے ہیں۔ اولاد کو چبھنے والا کانٹا ماں باپ کے دل پر زخم چھوڑتا ہے۔

زندگی ساٹھ ستر سالہ وقت کی میعاد کا نام نہیں ہے...... یہ ہر سانس کو زندگی کرنے کا نام ہے......

اس نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ لمس نیا تھا اور خوش کن بھی۔ اس کی آنکھ کھلی۔ وہ کاؤچ پر ہی سو چکی تھی۔ ایک بچی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ کمرے کی چھت تک بلند شیشے کی دیواریں صبح کا سورج دکھا رہی تھیں۔ سبزے کے قطعات پر کچھ اجنبی پرندے پھدک رہے تھے...... گھاس سبز تھی...... جو اس سے پہلے کبھی نہیں رہی تھی......

''ہیلو......'' بچی نے اس کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ ہاتھ میں پکڑا پھولوں کا گلدستہ اس کی طرف اٹھایا۔

''ہائے......'' اسے بچی اور بچی کی مسکراہٹ اچھی لگی۔ پھول بھی اجنبی تھے لیکن خوب صورت تھے۔

''کون ہو تم؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں؟'' کمرے میں آنے والا وہ پہلا انسان تھا جسے دیکھ کر وہ مسکرا رہی تھی۔ پھول آخر کار اس نے تھام لیے تھے۔

''میں؟ میں تو شیلے ہوں۔ آپ کے لیے پھول لائی تھی؟'' جھک کر اس نے اس کے گال کو چوما۔ ''بہت دیر سے سو رہی ہیں آپ...... کیوں؟''

''میں سو تو نہیں رہی تھی...... مجھے اب نیند نہیں آتی......''

''آپ ابھی بھی نیند میں ہی ہیں...... جاگ جائیں گی تو آپ کو اچھا لگے گا۔''

ایک بار پھر گال چوما اور کمرے سے چلی گئی۔ پھولوں کو اس نے ڈسٹ بن میں نہیں پھینکا تھا، انہیں میز پر رکھ دیا تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ باہر آ گئی۔ گم صم سے ماما، پاپا لیونگ ایریا میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سب کام اب ختم ہو چکے تھے۔

''شیلے کہاں ہے ماما؟؟'' وہ آج خود ہی کمرے سے باہر آئی تھی۔ دونوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ پاپا فوراً اس کی طرف بڑھے۔ اسے اپنے ساتھ لگا کر پیشانی پر پیار کیا۔

''کون شیلے......؟؟'' ماما جلدی سے کچن کی سمت بڑھیں۔ آج وہ بھی ناشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں بھوک لگ گئی تھی۔

''میرے لیے بھی ناشتہ بنا دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' پاپا نے کہا۔ ھدی اپنا سر ان کے شانے پر رکھ کر بیٹھ چکی تھی۔

''ابھی جو میرے کمرے میں آئی تھی......'' ہاتھ بڑھا کر اس نے آج کا نیوز پیپر اٹھا لیا تھا۔

فریج کھول کر کھڑی ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ دونوں کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ ھدی سے سوال کریں، یا اس کے سوال کا جواب دیں۔

''آں...... ہاں وہ آئی تھی...... شاید اسے اسکول جانا تھا...... جلدی میں تھی......'' پاپا نے کہا۔

''پر وہ ہے کون؟ اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کے کسی فرینڈ کی بیٹی......؟؟''

Sumaira Hameed:Author

ماں باپ دونوں کی نظریں ملیں۔ ''وہ ہمارے ہمسائے سے آئی تھی ...... شاید ...... ''ماں نے شاید کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھا۔
جب وہ ناشتہ کر رہی تھی، تو وہ دونوں اپنے لقمے زہر مار کر رہے تھے۔ وہ بار بار نظریں چرا کر حدی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ کوئی بچی ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ وہ کسی شیلے کو نہیں جانتے تھے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

ائم اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دونوں کی زبان قینچی کی طرح چلا کرتی تھی لیکن اب دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ ماما نے اسے لان میں بٹھایا تھا کہ شاید وہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ وہ سب سے ملنے سے صاف انکار کر دیا کرتی تھی لیکن ائم کا نام سن کر وہ ماما کو دیکھ کر رہ گئی۔

''اب تو میں بدنصیب نہیں رہی ائم؟؟'' دونوں کے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی تھی۔ جو اس نے ایسے توڑی تھی۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

''آئی ایم سوری حدی! یقین جانو وہ سب مذاق تھا۔ اور تم نے سچ کہا تھا، میں واقعی میں یہ حسرت رکھتا تھا کہ وہ بدنصیب انسان میں ہوتا جو تمہاری جگہ ہوتا۔ جوایسی پرآسائش زندگی گزار رہا ہوتا۔'' ائم کی نظر اس نئی حدی پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھی تھی

''تو کیا اب بھی تم یہی حسرت رکھتے ہو؟؟ میری جگہ آنا چاہو گے؟؟'' وہ طنز سے ہنس دی۔

''ہم جگہ ہی تو نہیں بدل سکتے حدی! اور ہم اپنی سوچ بھی نہیں بدل سکتے۔ اگر ایسا کر سکتے تو تمہارے ماں باپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہاری جگہ لے چکے ہوتے۔ تمہیں دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو گا جو یہ حسرت نہیں کرتا ہو گا کہ کاش وہ حدی کی جگہ ہوتا۔ اب تم یہ خواہش کر رہی ہو گی کہ کاش تم میری جگہ ہوتیں۔ مجھ جیسی غریب، بدحال، پارٹ ٹائم جاب کرنے والی، ایک ایک پینی کا حساب رکھنے والی، لیکن صحت مند، زندگی کی گارنٹی کی سند رکھنے والی ...... کیا ایسا ہی ہے حدی؟؟''

''ہاں ...... میں دنیا کا کوئی بھی شخص ہوتی لیکن حدی نہ ہوتی ......'' اس نے سچائی کا اعتراف کر لیا۔

ائم نے گہرا سانس لیا۔ حدی کتنا بدل چکی تھی۔ اسے تکلیف ہوئی تھی۔

''ہم سب ہمیشہ اپنی جگہ بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کسی دوسرے کی زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ہمیں جو میسر ہوتا ہے، ہم اس پر راضی ہی نہیں ہوتے ...... ہم نے ہم بن کر رہنا سیکھا ہی کب ہے؟''

''مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے ......؟؟''

''کچھ کہنے کے لیے ...... کہ تم اپنی جگہ پر ہی رہو۔ اس بیماری کی مریضہ کی جگہ ...... زندگی کی جنگ لڑنے والی لڑکی کی جگہ ...... یقین کرو، یہی تمہاری بہترین جگہ ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو زندگی کی چند سانسوں کے لیے تڑپ رہے ہوں گے۔ بچے کو جنم دیتی ماں، جو اپنی سانسیں توڑ رہی ہے، اسے چند سانسیں اور چاہیے تاکہ وہ بچے کو دنیا میں لا سکے۔ سڑک کنارے حادثے سے دم دیتا تین بچوں کا باپ، وہ اپنے بچوں کو، باپ کے بغیر زندگی گزارنے کے لیے حوصلہ دینا چاہتا ہے۔ چند نصیحتیں ...... اور سینے سے لگا کر چومنا

Sumaira Hameed:Author

چاہتا ہے۔ وہ بس چند سانسیں اور چاہتا ہے۔ بستر مرگ پر پڑا بیمار پشیمان جو اپنے پیاروں سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ سرحد پار کرتا سرزمین بچہ......وہ تو بس ایک نئی سرزمین کا سورج دیکھنا چاہتا تھا......

لاکھوں، کروڑوں لوگ اب بھی تمہاری جگہ لینا چاہتے ہوں گے حدی! ان کے لیے چند مہینے، چند ہفتے چند لمحے، چند سانسیں ہی بہت ہوں گی۔ اس لیے حدی تم اپنی جگہ پر ہی رہو۔ میں جانتا ہوں سب کہنا آسان ہوتا ہے اور کرنا مشکل...... میں آسانی سے کہہ رہا ہوں......تم مشکل سے ہی سہی لیکن اسے آسان کرلو......''

وہ چپ چاپ لائم کو دیکھ رہی تھی......

''خدا ہمیں ہمارے ظرف (ہمت، حوصلہ) کے مطابق آزماتا ہے حدی! اگر یہ آزمائش بڑی ہے تو تمہارا ظرف بھی بڑا ہی ہوگا......تم نہیں جانتی ہوگی...... یہ جنگ بڑی ہے تو فتح بھی بڑی ہوگی......تم جانتیں نہیں...... جو جانتا ہے، وہ آزما رہا ہے......تمہارے اندر چھپی ہوئی طاقتوں کو باہر نکالنے کے سامان کررہا ہے...... اُسے یہ کرنے دو...... اس کے ساتھ تعاون کرو......''

لائم چلا گیا...... وہ اسے ایک آخری بار ہاسپٹل جانے پر راضی کر گیا تھا......

وہ ہاسپٹل آ گئی تھی۔ دو گھنٹے کی میٹنگ، دس ڈاکٹروں کا بورڈ، اس کی سب رپورٹس، اور ان کی امید بھری باتیں...... وہ بے نیازی سے اپنے ناخن چباتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ جب وہ بول بول کر تھک گئے تو اس نے سب کی طرف دیکھ کر سرد مہری سے پوچھا۔

''میں نے سب باتیں سن لیں، سمجھ لیں۔ بس ایک سوال کا جواب دے دیں۔ کیا میں زندہ رہوں گی؟''

''ہمیشہ تو کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔'' ہیڈ ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا میں کم سے کم چالیس پچاس سال اور زندہ رہوں گی؟''

''میں چالیس پچاس سیکنڈز بعد زندہ ہوں گا یا نہیں یہ میں بھی نہیں جانتا۔''

''میں جانتی ہوں...... آپ چالیس پچاس سال بعد بھی زندہ رہیں گے، کیونکہ آپ اس کرسی پر نہیں بیٹھیں جس پر میں بیٹھی ہوں۔'' وہ کرسی الٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں حقیقت تسلیم کر چکی ہوں۔ آپ سب بھی کر لیں اور مجھے بیہودہ خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکانا بند کریں۔ میں آپ کو خود کو دھوکا دینے نہیں دوں گی۔'' وہ میٹنگ روم سے باہر آ گئی۔ وہ واپس پرانے فیز میں چلی گئی تھی۔

اس کی چال میں تندی تھی۔ وہ راہداری عبور کر رہی تھی کہ اسے ٹیرس پر کھڑی بچی پر شیلے کے ہونے کا گمان ہوا۔ تیز تیز اٹھتے اس کے قدم تھم گئے۔ وہ شیلے نہیں ہو سکتی، یہ دیکھنے کے لیے وہ اس کی سمت بڑھ گئی......

وہ شیلے ہی تھی۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں پھول تھے۔

''شیلے......تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' سر کو اس کی سمت جھکا کر کہا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔

جواب دینے کی بجائے اس نے پھول اس کی سمت بڑھا دیئے۔ ''آپ کا انتظار کر رہی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آئی ہوں؟'' اس نے اس کے گالوں پر پیار کیا۔

Sumaira Hameed:Author

ہنس کر اس نے اپنا رخ آسمان کی سمت پھیر لیا اور ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔''مجھے آسمان بہت پسند ہے۔اور آپ کو؟''

''مجھے......؟؟ مجھے اب کچھ بھی پسند نہیں رہا......''

شیلے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے ہاتھ کی طرح آسمان کی سمت بلند کر دیا۔

''جو زمین پر نہیں ہو سکتا......وہ آسمان سے ہوتا ہے......ضرور ہوتا ہے......اسی لیے مجھے آسمان پسند ہے......''

اس کا جسم مجسمہ ہوا......اس نے ایک نظر آسمان اور ایک نظر شیلے کو دیکھا......

''رونا اچھا ہوتا ہے لیکن یہ طے کر لیں کہ رونے کے بعد ہنسنا بھی ہو گا۔''اپنے ننھے ہاتھوں سے وہ اس کے بھیگے گال صاف کرنے لگی۔

وہ ایکدم سے ہنس دی۔

شیلے کے دیے پھول کمرے میں میز پر رکھے تھے......ان پھولوں پر آسمان کا سایہ پڑ رہا تھا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

شیلے کے دیے پھول کمرے میں میز پر رکھے ہیں......ان پھولوں پر آسمان کے چراغ کا سایہ پڑ رہا ہے......

صبح اٹھتے ہی وہ شیلے سے ملنے کے لیے ہاسپٹل جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔اس نے ماما پاپا کے ساتھ ناشتہ بھی کیا تھا۔باپ کے گال پر پیار کر کے، انہیں آفس جانے کے لیے کہا تھا۔اپنے لباس پر توجہ دی تھی۔اچھی طرح سے منہ دھو کر، ماما کی ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر لپ گلوز لگایا اور پرفیوم سپرے کیا تھا۔وہ شیلے سے اچھی حالت میں ملنا چاہتی تھی۔راستے میں اس نے اس کے لیے پھول اور چاکلیٹس لیں۔ایک چھوٹا سا بیئر بھی لے لیا تھا۔

''مجھے شیلے سے ملنا ہے۔وہ یہاں کسی وارڈ میں ایڈمٹ ہے......''کمپیوٹر پر شیلے کا نام ٹائپ کرتے، ریسپشنسٹ کے ہاتھ رک گئے۔جیسے اسے ایکدم سے کچھ یاد آیا تھا۔اس نے سر اٹھا کر حدی کو دیکھا۔اسے کمپوز ہونے میں کچھ وقت لگا۔

''شیلے؟؟ نو، دس سال کی بچی؟؟''وہ پوچھ رہی تھی۔کنفرم کر رہی تھی۔

اس نے سر ہلا دیا......

''میرے ساتھ آئیں......''وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔وہ سنیئر ڈاکٹر کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔

''شیلے تمہیں کہاں ملی تھی حدی!اور کب......؟؟''لیڈی ڈاکٹر ریسپشنسٹ کی نسبت کم حیران ہوئی تھیں۔

حدی نے چیئر پر بے چینی سے پہلو بدلا۔اسے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

''پہلی بار وہ مجھے گھر ملنے آئی تھی۔پھر وہ مجھے اس ہاسپٹل کے کوریڈور میں ملی تھی۔اس نے بتایا وہ بھی بیمار ہے۔یہیں ایڈمٹ ہے۔وہ ٹھیک تو ہے ڈاکٹر......اسے کچھ......''وہ گھبرا گئی......زبان اٹکنے لگی۔

''وہ ٹھیک ہی ہو گی جہاں بھی ہو گی۔ان فیکٹ......وہ یہاں اٹھارہ سال پہلے آئی تھی۔''

Sumaira Hameed:Author

وہ ہنس دی۔''ڈاکٹر اس کی عمر نو دس سال ہے۔ آپ کے پاس وہ اٹھارہ سال پہلے کیسے آسکتی ہے؟؟''

''یہ سچ ہے حدی! یہاں کے ریکارڈ کے مطابق وہ یہاں اٹھارہ سال پہلے آئی تھی۔ وہ ایک یتیم خانے میں رہتی تھی۔ فیملی کے نام پر اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ چھ سال تک اس کا علاج چلتا رہا تھا۔ کچھ این جی اوز نے مل کر اس کا علاج کروایا تھا''

''چھ سال......'' اسے جھرجھری آگئی۔ آواز حلق میں دم توڑنے لگی۔''کیا ہوا تھا اسے؟؟''

''بون کینسر......''

بون کینسر......''اس کی آواز کپکپا گئی۔''اور پھر......وہ ٹھیک ہوگئی تھی؟؟''

''وہ ٹھیک ہو چکی تھی۔ اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ یہاں علاج کے لیے آنے والے اکثر مریض ہم سے شیلے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انہیں پھول دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے دیے پھول بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ جب وہ مسکراتی ہے تو ان کے دل ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔''

ہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ حیران ڈاکٹر کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔

''اس کا مطلب اس وقت شیلے کی عمر کم سے کم ستائیس اٹھائیس سال ہوگی......تو پھر وہ مجھے......وہ......''

''جس ایج میں وہ تمہیں ملی ہے، اس عمر میں وہ بہت زیادہ تکلیف سے گزر رہی تھی۔ آٹھ، نو اور دس سال کی عمر میں۔ ایک نارمل صحت مند اور طاقت ور انسان، تکلیف کی جس شدت کو برداشت کر سکتا ہے، وہ اس سے تین گنا زیادہ تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ مسکراتی رہتی تھی۔ وہ کبھی روئی بھی نہیں تھی۔ سنیئر ڈاکٹرز آج بھی اس کے ہمت و حوصلے کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ شاید خدا کو اس کی یہی بہادری پسند آگئی کہ اسے اُمید کا استعارہ بنا دیا۔ اس کے ہاتھ میں پھول دے دیے اور چہرے پر مسکراہٹ۔''

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی۔''ینگ شیلے اس وقت کہاں ہے؟؟'' وہ مشکل سے یہ سوال پوچھ سکی۔

''میں نے کہا نا حدی! وہ ایک یتیم خانے سے تھی۔ چند اور لوگوں کے کہنے پر اس یتیم خانے سے رابطہ کیا گیا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ بالغ ہونے پر وہ ملک چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کہاں یہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر اسے زیادہ شدومد سے اس لیے بھی نہیں ڈھونڈا گیا کہ جن لوگوں سے وہ ملی تھی، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ سب ایسے ہی تو اسے ایسے ہی رہنا دیا جائے۔ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعہ کی کھوج میں نہیں لگنا چاہیے......اگر یہ خدا کا کوئی راز ہے، اور شیلے اس راز میں شریک ہے تو اسے ایسے ہی رہنا دیا جائے۔''

وہ بے یقینی سے ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے ایسی کہانی سنا رہی تھیں، جس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا وہ نیند میں ہے، ابھی جاگ جائے گی۔

وہ جاگ گی تو وہ کڈز وارڈ میں تھی۔ وہ وہاں شیلے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن شیلے وہاں بھی نہیں تھی۔ اس نے کچھ نرسز سے شیلے کے بارے میں پوچھا۔ لیکن شیلے کہیں نہیں ملی......ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ بھری دنیا میں وہ صرف شیلے سے ملنا چاہتی تھی، اور بھری دنیا میں وہی غائب ہو گئی تھی۔

Sumaira Hameed:Author

اس کے دیئے پھول ابھی تک اس کے کمرے کی میز پر رکھے تھے...... پھول وہیں تھے پھر شلے کہاں تھی......؟؟

گھر آ کر اس نے سب سے پہلے پھولوں کو دیکھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے انہیں اپنے قریب کر لیا تھا۔ اس نے ابھی تک ان پھولوں کو سونگھا نہیں تھا۔ وہ انہیں اپنی ناک کے قریب لے آئی۔ اسے عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے دوبارہ انہیں سونگھا اور دیر تک خوشبو کو جانچتی رہی۔ پھر اس نے گردن کو شانے کی طرف جھکا کر خود کو سونگھا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی۔ پھولوں میں سے اس کی اپنی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ ایک دم سے سہم گئی۔ پھولوں کو اس نے خود سے دور رکھ دیا...... وہ انہیں سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی...... تو کیا اب جیسے جیسے پھول مرجھائیں گے ویسے ویسے اس کی صحت کے گرنے کی نشاندہی کریں گے۔ اب یہ پھول اسے بتائیں گے کہ وہ کب تک تروتازہ رہنے والی ہے۔

اس کا سر گھوم رہا تھا...... ''مجھے آسمان پسند ہے......'' اس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''جو زمین پر نہیں ہو سکتا...... وہ آسمان سے ہوتا ہے......''

جھپٹ کر اس نے پھول اٹھائے۔ اپنی زندگی کے دنوں کی طرح اس نے انہیں گننا چاہا، لیکن وہ انہیں گن نہیں سکی۔ لگا وہ چھ ہیں۔ پھر لگا چھ سے تو بہت زیادہ ہیں...... اس کی آنکھیں بار بار دھندلا رہی تھیں۔ وہ انہیں انگلی سے الگ الگ کرنے کے باوجود گن نہیں پا رہی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ وہ رو دینے کو ہو چکی تھی۔ یہ اس کے ساتھ سب کیا ہو رہا تھا۔ اس نے وقت بتانے والی ہر شے ختم کر دی تھی، خود کو گنتی بھلا دی تھی، پھر یہ پھول...... یہ اس کی زندگی کی گھڑی بن کر کیوں آ گئے تھے...... اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی تھی؟

بیک وقت دکھی اور پاگل...... ٹوٹی ہوئی اور غمزدہ...... تنہا اور اکیلی...... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی......

کتنی ہی دیر تک روتی رہی...... اتنی دیر تک کہ دن جو روشن تھا، وہ مدھم ہوتے ہوتے، رات کی روشنی میں ڈوبنے لگا...... آسمان پر کوئی ستارہ تو ظاہر نہیں ہوا تھا، لیکن ایک ستارہ تھا، جو اس کے قریب ہی...... بس قریب ہی روشن ہو جانے کو تھا......

میز پر رکھے کرسٹل کے گلاس نما گلدان کو اس نے کچھ دیر تک گھورا، ہتھیلی سے اپنے آنسو پونچھے اور بڑھ کر گلدان اٹھا لیا اور پوری شدت سے، ساری نفرت سے، کامل بے یقینی سے، مکمل بے ایمان ہو جانے سے شیشے کی چھت تک اٹھی دیوار پر دے مارا......

دور خاموش پڑی جھیل اور اس کے آب، کنارے خاموش پڑے سوان اور ان کی آواز...... اس سے آگے درختوں کے جھنڈ...... اور جھنڈ سے آگے کائنات...... شیشے کی دیوار کے ٹوٹنے کی آواز کائنات کی ہر شے نے سنی......

شیشے کے ٹکڑے تیز آندھی کی طرح پیچھے کی سمت ٹوٹے...... لیکن ان کے زروں کے زمین پر گرنے سے کچھ پہلے...... اتنی پہلے کہ انسان پلکیں گرائے اور اٹھا بھی لے...... اس سے بھی کم وقت میں، روشنی کی سمت سے، سب کچھ کر گزرنے والے آسمان کی بلندی سے وہ آیا......

وہ اندھیرے میں اندھیرہ بن کر آئے تو بھی روشنی ہوتا ہے......

''سب تعریفیں اللہ کے لیے......جس نے تمہیں انسان پیدا کیا اور مجھے تمہارا نگران...... ''نگران فرشتہ''......'' اس نے کہا۔

Sumaira Hameed:Author

اس کی ایسی زبردست موجودگی پر وہ اسے دیکھنے لگی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

کرسٹل کا گلدان ٹوٹ چکا تھا۔ شیشے کی دیوار بھی۔ وہ جھک کر کرچیوں میں سے ایک ایک پھول الگ کر رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

نہ وہ دیکھ کر حیران تھی، نہ سن کر۔ اسے ایسا نہیں لگا کہ وہ کسی اجنبی سے مل رہی ہے۔ وہ تو اسے ہمیشہ سے جانتی تھی۔ بچپن سے۔ ایک ایک لمحے سے..... لیکن وہ کبھی اس کی موجودگی کی قائل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آواز نے اسے یاد دلا دیا کہ یہ آواز اکثر اس کے کانوں میں گونجتی تھی۔ تب یہ آواز ''بے آواز'' تھی، اب یہ کلام تھی......

جب وہ پہلی بار یونیورسٹی میں کانووکیشن کے دوران سیڑھیوں سے گر گئی تھی تو ایک لامکاں لمحے میں اس کی صورت دکھائی دی تھی۔

''اسے ہی پست کیا جاتا ہے، جسے بلند کرنا ہو۔ اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ حدیٰ!'' وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

پھر جب وہ اوپیرا شو سے نکل کر پیرس کی سڑکوں پر بھاگ رہی تھی تب وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس لڑکی کی صورت جو..... to make the stars came out (ستاروں کی قندیلیں جلا دو) گاتی جا رہی تھی..... وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے اس مزاحیہ بورڈ میں بھی تھا۔ جو ''کہاں جا رہے ہیں آپ؟ یہاں آئیے، یہاں پینے کے لیے زندگی اور کھانے کے لیے ''امید'' ملتی ہے۔'' کہہ رہا تھا۔

ماں کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتا بچہ..... ''آپ نے کہا تھا زندگی بہت خوب صورت ہے، وہ مجھے پرپل ڈریس میں بھاگتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے..... مجھے اس سے مل لینے دیں......''

جس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بے ہوش ہوئی، لامکاں لمحے میں وہ اسے پھر دکھائی دیا تھا......

''جو زمین والے نہیں کر سکتے..... وہ آسمان والا کرتا ہے..... اپنے یقین کو بیدار کرو۔ خود کو بیدار کرو حدیٰ!''

وہ بیدار ہو چکی تھی۔ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ سب پھول سمیٹ کر وہ اس کے قریب آیا اور ان پھولوں کو اس کی سمت بڑھا دیا۔

''دو تمہارے دائیں بائیں، دو آگے اور پیچھے ہیں اور ایک میں ہمیشہ ساتھ رہتا ہوں۔ اور میں ہمیشہ خیر کہتا ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''تم نے اپنی طرف کھلنے والے سب دروازے بند کر دیے تو مجھے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر آنا پڑا..... حدیٰ! یہ تمہارا نام ہے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

''حدیٰ..... یہ تمہارا نام ہے..... درست ہدایت..... یہ تمہارے نام کا مطلب..... پھر تمہارا عمل بھٹکنا کیوں ہے؟''

دونوں نے وقت کو کچھ وقت دیا......

''اب پھر تم مجھے نصیحتیں کرنے آئے ہو۔ میرا کسی بھی بات پر کوئی یقین نہیں ہے۔'' اس نے ''پھر'' کہا۔ وہ اسے پوری طرح سے پہچان چکی تھی۔ جیسے ہزار سال انسان آئینے سے دور رہے، اور ہزار سال بعد خود کو آئینے میں دیکھے اور فوراً پہچان جائے۔ ''یہ میں ہوں۔''

Sumaira Hameed:Author

یہ وہ تھا...... اس کا فرشتہ...... اپنی چیزیں، اپنے لوگ، اپنا سایہ، اپنا آپ...... اپنا نگران پہچانے میں وقت نہیں لگتا۔

''ایک خالی ڈبہ بھی تم سے اچھا ہے، کم سے کم اس میں ہوا تو ہے۔'' وہ بیٹھ چکا تھا۔ وہ بدستور کھڑی تھی۔

''تم مجھے نیچا دکھانے آئے ہو؟؟؟''

''خود (مقصد حیات) کو پانے کی کوشش کرو، اس سے پہلے کہ موت تمہیں پالے۔'' (کانفرنس آف دی برڈز) اس نے کہا۔

وہ نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی...... وہ سوالیہ تھی......

''جیسے اس لڑکی نے خود کو پایا تھا...... وہ بھی بیمار ہوگئی تھی......؟''

''کون لڑکی......؟؟''

''دھی...... بہت پیاری لڑکی...... بہت جرات مند......''

''کیا بیماری تھی اسے......؟؟'' اتنے دنوں میں پہلی بار وہ حسد کا شکار ہوئی تھی۔ کسی کی تعریف پر......

''جذام (کوڑھ)......''

اسے جھرجھری سی آئی لیکن وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ ''جذام...... یہ قابل علاج ہے۔ لوگ اس سے مرتے نہیں ہیں......'' وہ طنز سے ہنس بھی دی تھی۔

''پہلے مرتے تھے حدی اشرم سے، ذلت سے...... تنہائی اور پھٹکار سے...... سب سے بڑھ کر لعنت سے۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ہنس نہیں سکا تھا......

''کیا تمہیں کسی نے لعنتی کہا؟؟ تمہیں پھٹکارا؟؟ غلاظت جان کر تمہیں دور پھینک آئے؟؟ کیا تمہاری ماں کو، دل پر پتھر رکھ کر، باپ کو سینے پر سلیں رکھ کر، خود سے الگ کر دینا پڑا؟؟''

وہ پوچھ رہا تھا...... وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی......

''کیا تمہارے اس چہرے پر کسی نے تھوک دیا اور کہا...... ''لعنت ہو تم پر؟'' جس پر خدا کی پھٹکار پڑی ہے، اس پر ہماری بھی پھٹکار ہو......؟؟''

وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ ''کیا کہہ رہے ہو...... کون تھی وہ......؟؟؟''

''دھیسا......'' وہ بتانے جا رہا تھا...... ڈوب چکے دن کی روشنی اس کی پشت پر غروب ہونے لگی تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

''دھیسا...... یہ اس کا نام ہے......''

دن کی روشنی اس کی پیشانی سے طلوع ہو رہی تھی۔ وہ چھ لڑکیاں یونانی کھیل، کھیل رہی ہیں۔ پانچ لڑکیاں دائرہ بنا کر کچھ دور دور کھڑی ہیں، چھٹی دائرے کے اندر کھڑی ہے۔ جو دائرے کے اندر کھڑی ہے وہ کپڑے سے بنی گیند اوپر اچھال کر، دائرے میں کھڑی پانچ

Sumaira Hameed:Author

میں سے ایک کا نام لے کر اپنی جگہ چھوڑ رہی ہے......

''دبیسا......''

دورین نے نام پکارا اور ہماری دبیسا نے، زمین پر گرنے سے پہلے، سراعت سے اچھل کر گیند پکڑ لیا...... سر پر کی چادر، دونوں شانوں سے پیچھے کمر پر گری ہے۔ وہیں سے پیچھے ہوا سے لہرا رہی ہے۔ بادبان کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہے......

وہ کافی وقت سے سمندر کنارے یہ کھیل کھیل رہی ہیں۔ مشرق کی سمت خاموش گھاٹیوں کا شہر دکھائی دیتا ہے...... اور وہ سامنے سب انسانوں اور ایک چڑیل کا شہر...... دبیسا کا شہر...... چند دنوں کی مسافت پر بیت المقدس، ان کا ہمسایہ شہر...... ہزاروں، ہزاروں سال پرانا، اس دنیا کا وہ ایک شہر......

جب وہ اس کھیل سے تھک گئیں تو نشانی رکھ کر، چھڑی سے لکڑی کے پہیہ دوڑانے لگیں۔ یہ کھیل شہر کے بچوں میں بہت مقبول تھا۔ وہ ان جیسی بچیاں تو نہیں تھیں لیکن اتنی بوڑھی بھی نہیں ہو چکی تھیں کہ یہ کھیل نہ کھیل سکتیں۔ دبیسا ان پانچ میں سب سے آگے نکل آئی تھی۔ دور سے آتا گھڑ سوار عین اس کے پہیہ کے پاس آ کر رکا۔ پہیہ اپنی دوڑ کا دم توڑ گیا۔ اس نے غصے سے گھڑ سوار کو گھورا۔ شہر کے اندھے کو بھی اتنی عقل تھی کہ ''دبیسا'' کا راستہ نہیں کاٹنا...... یہ کون سا اندھا تھا جس نے اس کی دوڑ کو کاٹ دیا تھا۔ اس کی سہیلیاں ہنسی دباتی ہوئیں اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔

''کیا چاہیے؟؟'' ہوا سے اس کی چادر پھڑ پھڑا تی رہی تھی اور غصے سے نتھنے......

''دبیسا......'' وہ اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ ''ایسا سا ہی نام ہے اس لڑکی کا۔ سنا ہے وہ یہاں کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ دو دن سے میں اس شہر میں ہوں، سوچا شاید تم میں سے ہی کوئی ہو۔ سنا ہے اس کا نخرہ آفتاب ہے اور مزاج تیز تلوار۔ ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں اسے۔''

''آں...... تم دبیسا کو دیکھنے آئے ہو...... اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے جو اسے دیکھنے آئے ہو'' وہ اسے گھور رہی تھی۔

''اگر وہ حسین ہے تو میں ذہین ہوں...... عقل و شعور مجھ پر ختم ہے۔'' اس نے گردن اکڑی۔ بے چاری گردن۔

''جو اپنی زبان سے اپنی عقل کا اظہار کرتا ہے...... وہ بے وقوفوں کا سردار ہوتا ہے......''

''بہت تیز زبان ہے تمہاری...... کیا نام ہے تمہارا؟''

''بتاتی ہوں نام، پہلے تمہیں راستہ بتا دوں...... دیکھو...... وہ ادھر...... تمہارے دائیں ہاتھ کنواں ہے...... اس میں کود جاؤ...... ورنہ بائیں ہاتھ تھوڑا سفر کرو، ایک گھاٹی آئے گی، اس پر سے کود جاؤ۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو ذرا انتظار کرو، میں مطب سے تمہیں زہر لا دیتی ہوں۔''

''زہر کیوں دبیسا! تمہارے دانت ناکارہ ہو گئے ہیں کیا؟'' اس کی سہیلی نے اسے یاد دلایا...... جلاد سہیلی......

''دانت؟؟ کیا مطلب ہے تمہارا......'' ''کس کے دانت؟ کیسے دانت؟؟'' بے چارہ گھڑ سوار

''مطلب صاف ہے، لوگ کہتے ہیں، میرا کاٹا پانی مانگے بغیر دل بند ہو جانے سے مر جاتا ہے۔ اب اگر تم ایسے مرنا ہی چاہتے ہو تو

Sumaira Hameed:Author

بس یہ بتا دو تمہاری قبر کہاں بنائی جائے۔ گھوڑے پر لاد کر سمندر میں پھینک دی جائے۔ یا لکڑیاں دہکا کر جھونک دی جائے۔ میرا خیال ہے آگ دہکا کر جھونک دی جائے، عرصہ ہوا شہر کو دھونی نہیں ملی۔ کیڑے مکوڑوں نے جان عذاب کر رکھی ہے۔ تمہاری دھونی سے وہ بھی مر مرا جائیں گے......''

''تو تم ہی دیبیا ہو؟ تمہاری زبان ہے یا کسی رومی کی تلوار؟ سانس لینے کے لیے رکتی ہے یا بس سانس کاٹ ڈالتی ہے؟؟''

''تمہیں لگا کہ رومیوں کا ذکر کرنے پر میں تمہیں جھک کر سلام کروں گی ...... ہاں ایسا ہی ہوگا ...... ٹھہرو ں مجھے جھک کر سلام کر لینے دو۔'' وہ چلتی ہوئی اس کے قریب گئی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ تب آیا جب اس کے دانت اس کی ٹانگ کے گوشت اور ہڈی میں پیوست ہو گئے......

کھلا سمندر...... خاموش گھاٹیاں...... اور ہنستا بستا شہر...... سب دیبیا کے کرتوں اور گھڑ سوار کی چیخوں سے گونج اٹھے......

☆ ...... ☆ ...... ☆

''دیبیا، دیبیا...... میں تمہارا کیا کروں...... کسی سے شادی کرو گی یا نہیں؟'' وہ تپ کر پوچھ رہے تھے۔

''والد...... والد...... والد...... مجھ سے نرم لہجے میں بات کریں۔ آپ کا لہجہ میرے دانتوں کی کاٹ سے زیادہ تیز نہیں ہونا چاہیے۔'' پتھر کی سل پر کھینچی لکیریوں پر وہ گوٹیاں رکھ رہی تھی۔

انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے۔''وہ اچھا ہوش مند نوجوان تھا دیبیا! تمہارے چچا نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔'' اب ان کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ دیبیا کی ہنسی نکل گئی۔

''واہ کیا ہوش مند تھا۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ سقراط کے پیالے میں کیا تھا......'' گوٹی کھسکا کر چال چلی۔

''کیا تھا؟؟ زہر نہیں تھا کیا......؟؟'' انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ اپنی ڈاڑھی کھجا رہے تھے۔ گوٹی ڈاڑھی میں الجھ گئی۔

''والد آپ کو بھی نہیں معلوم...... والد آپ کو بھی......'' وہ چلا اٹھی۔ کھینچ کر ڈاڑھی سے گوٹ الگ کی۔

''آں دیبیا...... وہ...... دراصل...... مجھے یاد تھا لیکن...... پتا نہیں کیسے بھول گیا...... بتا دو میری جان کیا تھا اس میں......''

''زہر تھا اور کیا...... وہ کہنے لگا سقراط کے پیالے میں سقراط کا اپنا عکس تھا۔ جب اس نے جھانک کر پیالے میں دیکھا تو اسے اپنی شکل دکھائی دی۔ میں نے اس کی شکل کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور کہا'' پیالے میں شفران پودے کا زہر تھا۔ لیکن تمہارے بھدے پیالہ نما سر میں عقل کی جگہ بم ہتورہ، ڈھول سب ہے۔ ایک نیک کام کرو، تھوڑا سا زہر تم بھی پی لو۔ جب سقراط مر گیا تو تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔''

''تمہیں سقراط، وقراط سے کیا لینا دینا میری دیبیا؟ گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، میرے لاڈ پیار نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔ سارے شہر کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ سب لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ تمہاری سب سہیلیاں لڑکوں میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔''

''مردوں میں جانوروں کی اور بھی قسمیں ہوتی ہیں والد! آپ یہ چوہے ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ خچروں کے ساتھ تو گزارا بالکل

Sumaira Hameed:Author

ہی مشکل ہے..... بلکہ محال ہے..... کیا خطہ زمین پر شیروں کی کوئی قسم موجود نہیں؟''

''شیر ہو مَن اکھاڑوں سے نبرد آزما ہیں..... اب بتاؤ وہ گھر کیسے بسائیں.....'' وہ چڑ گئے۔

''جبکہ ان خچروں کو ان اکھاڑوں میں کھپنا چاہیے.....'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''دبیسا.....'' ان کی آواز ذرا پھر سے بلند ہوئی۔

''والد..... چپ کر جائیں والد..... چپ کر جائیں.....'' اس نے چیخ کر گونی ماری۔ گونی تو بچ گئی لیکن والد سہم گئے۔

''ساری دنیا میرے حسن سے رعب کھاتی ہے۔ آپ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ دبیسا کا باپ کیسا ظالم ہے۔ رومی کیا کہیں گے۔ دبیسا کا باپ کیسا جلاد ہے۔ رومیوں کی بیویاں کیا کہیں گی؟ دبیسا کا والد کیسا سخت کلام ہے..... نہ کریں والد..... نہ کریں۔ ورنہ آپ کے ہاتھ پیر باندھ کر میں آپ کو گھاٹی تک لے جاؤں گی۔ وہاں چھوڑ آؤں گی..... چھوڑ کر بھول آؤں گی۔ ہزاروں سالوں بعد جب آپ کو لینے جاؤں گی تو پھر یہی کہوں گی'' چپ کر جائیں والد میرے لیے یہ چوہے ڈھونڈنا بند کر دیں۔''

والد کا ہنس ہنس کر برا حال ہو چکا تھا..... ''دبیسا تمہاری زبان..... تمہارا کلام..... میرا تو دل موہ لیتا ہے میری جان۔ پر شہر کے لوگوں پر رحم کرو، انہیں کاٹنا بند کرو۔ گھر میں سبزیاں پھل سب رکھے ہیں۔ بھیڑیں بھی ہیں، انہیں کام میں لے آؤ۔ چاہو تو کچا گوشت کھایا کرو، لیکن اجنبیوں کو کاٹنا بند کرو۔ شہر کے لوگوں نے تو عرصہ ہوا تمہارے تیز دانتوں کے وار پر واویلا مچانا چھوڑ دیا۔ شہر بھر میں شاید ہی کوئی خوش قسمت ایسا بچا ہوگا، جو تمہارے دانتوں کے وار سے بچ گیا ہوگا۔ آج تم نے ایک خاتون کے بھائی کو کاٹ کھایا۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بد دعائیں دے رہی تھی وہ تمہیں۔ وہ تو تمہیں جان سے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے انہیں بہت مشکل سے ٹھنڈا کیا..... تین بھیڑوں پر معاملہ ختم ہوا۔ اگر سچ کہوں تو تم نے اسے ایسے کاٹا کہ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ دبیسا بس کر..... و.....''

''آپ پھر بولے والد..... پھر بولے آپ؟؟'' اس نے کپڑا پکڑ کر والد کے ہاتھ باندھنے شروع کر دیے۔ پھر دوسرے کپڑے سے ان کا منہ باندھ دیا۔ دہلیز تک جا کر اصطبل کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ اصطبل کا ملازم جلدی سے گھوڑا لے آیا۔ والد کو اسی حالت میں گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھایا۔ خود وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھی اور والد کے گھوڑے کو گھاٹیوں کی طرف لے جانے لگی۔

وہ جو کہتی تھی..... وہ کرتی تھی.....

دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بازار کے لوگوں نے دبیسا کے والد کو ایسی حالت میں دیکھا تو ہنسنے لگے۔ والد خود بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن دبیسا نہیں ہنس رہی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ جب کسی کو سزا دی جائے تو پھر سنجیدہ رہا جائے، ورنہ سزا ایک مذاق بن کر رہ جائے گی۔

''دبیسا! اپنے والد کو کہاں لے جا رہی ہو.....؟؟'' سبزیوں، پھلوں کی ٹوکریوں کے ڈھیر کے پاس کھڑے چچا نے پوچھا۔

''والد کو سبق سکھانے..... گھاٹی تک لے جا رہی ہوں..... بہت دن ہوئے انہوں نے سورج کو غروب ہوتے نہیں دیکھا۔''

''لیکن وہاں تو بہت چوہے ہوتے ہیں.....'' چچا نے فکرمندی سے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ لیا۔

Sumaira Hameed:Author

''بہت دن ہوئے انہوں نے چوہے بھی نہیں دیکھے......''اس نے ہنسی دبانے والوں کو گھور کر دیکھا......ایک ایک کو......

''وہ چوہے تو بہت زہریلے ہیں، کاٹتے ہیں تو ناسور بن جاتا ہے......''

''آپ کی بہت سلام دعا ہے ان چوہوں سے چچا! آئیں آپ کو بھی ان سے ملواتی ہوں۔ اپنا حال چال کہہ لیجئے گا ان کا سن لیجئے گا۔ جی چاہا تو ایک آدھ کو بھون کر کھا بھی جایئے گا......''

بازار کے لوگ ہنسنے لگے۔ اس کی حرکتیں بچکانہ، بیوقوفانہ، باتیں دلیرانہ، دلربانہ تھیں۔ وہ کسی سے ڈرتی ہی نہیں تھی......

''اچھا یہ تربوز لیتی جاؤ۔ بہت میٹھا ہے۔ راستے میں کھا لینا۔''چچا نے ایک تربوز دو ٹکڑے کر کے اس کی سمت بڑھایا۔ چچا پر احسان کرتے ہوئے اس نے تربوز قبول کر لیا، اور تربوز کے سینے میں دانت گاڑ دیے......

''اتنا بھی میٹھا نہیں ہے جتنا چہک کر آپ نے کہا تھا......''تربوز تو واقعی میٹھا تھا، لیکن وہ اتنی جلدی کیوں مانتی۔

''تربوز لیا ہے تو شکریہ بھی کہہ دو دیبا......''چچا باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس نے لگام کو جھٹکا دیا۔''چچا! لگتا ہے آپ کا بھی گھاٹی تک جائے بغیر گزارا نہیں ہوگا۔ آپ کی پسلی پھڑک رہی ہے۔ آپ شرافت سے والد کے پیچھے بیٹھیں گے یا میں نیچے اتر کر یہ انتظام کروں؟''

چچا نے شریفانہ سا قہقہہ لگایا۔ ہاتھ جوڑ دیے۔''ناں، ناں......اپنے والد کو ہی لے جاؤ۔ میں اپنی پسلی کا علاج کرواتا ہوں۔ دوبارہ یہ تمہارے سامنے نہیں پھڑکے گی۔ ویسے ایک بات ہے دیبا! میری خواہش ہے کہ تمہاری شادی کسی رومی سے ہو، تاکہ جو آدھی دنیا فتح ہونے سے رہ گئی ہے وہ تم فتح کر لو۔ تلوار تمہارے کس کام آئے گی، جب زبان ہی سب کام کرنے کے لیے کافی ہے۔''

''والد کی ایک تلوار دیوار پر لٹکی ہے، کہیں تو آپ کا کام اس سے تمام کر دوں؟''

ایک زوردار قہقہہ بازار میں گونجا......سب ہنسنے لگے

''آپ کی پسلی کا تو پتا نہیں لیکن اب میری پسلی پھڑکنے لگی ہے۔''وہ گھوڑے سے اترنے لگی تو چچا قہقہہ لگاتے ہوئے، بازار سے بھاگ گئے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

دونوں باپ بیٹی ایک گھاٹی کی بلندی پر پیر لٹکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سمندر کی لہروں کا شور، پرندوں کی چہچہاہٹیں، ہوا کی سرمستیاں، اور غروب ہوتے سورج کی الوداعی کرنیں......دنیا کیسی خوب صورت تھی......

''ایک اور سورج غروب ہو گیا......''والد نے آہ بھر کر کہا۔

''آج کا سورج، کل کے سورج کے لیے رخصت ہو گیا۔ آپ نے ایسے کیوں نہیں کہا والد؟''تربوز کھاتے دیبا نے پوچھا۔

وہ ہنس دیے۔''تم بچی ہو۔ تمہارے پاس بہت سورج پڑے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ایک ایک سورج کو انگلیوں پر گنتا ہوں۔ میری عمر کے دن ہی کتنے بچیں ہوں گے۔''

Sumaira Hameed:Author

''زندگی میں بہت سورج دیکھے، اب اگلی زندگی کا سورج دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ''آپ نے ایسے کیوں نہیں سوچا؟''

وہ ہنسنے لگے۔''تم پر امید ہو......''

''آپ کے ناامید ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟؟''

''تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا......؟؟

''کیا زندگی نے آپ کو ڈرایا؟؟ اگر نہیں تو پھر موت سے کیسی ناراضی؟''

''اگر میں مر جاؤں تو کیا تمہیں دکھ نہیں ہوگا۔'' وہ حیران اپنی دیبا کی صورت دیکھ رہے تھے۔

''بہت ہوگا۔غم سے میرا دل پھٹ جائے گا۔لیکن کیا آپ اکیلے ہیں جو مر جائیں گے؟ کیا میں ہمیشہ زندہ رہوں گی؟''

انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔''مجھے تم پر فخر ہے دیبا......'' وہ لاجواب ہو چکے تھے۔

''آپ کو مجھ پر ہمیشہ فخر رہے گا......''

''پھر ایسا کرو،لوگوں کو کاٹنا بند کردو۔جب لوگ اپنی کھال پر تمہارے دانت دکھاتے ہیں تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرہ چھا جاتا ہے۔''

''زیادہ روشنی بھی اچھی نہیں ہوتی والد! کبھی کبھی اندھیروں سے بھی سلام دعا کر لینی چاہیے۔ایسے روشنی کی قدر بڑھ جاتی ہے۔''

''میری دیبا!لوگوں پر رحم کرو......تم کاٹتی کیوں ہو؟ میں آج تک نہیں سمجھ سکا......''

''اچھے سے اچھے انسان میں بھی ایک بری خصلت ہوتی ہے والد......''

''پر وہ تو اچھے انسان میں ہوتی ہے......میں تو تمہاری بات کر رہا ہوں......''

دیبا نے گھور کر باپ کو دیکھا اور باپ کا قہقہہ گھاٹیوں کے سناٹوں میں گونجنے لگا۔

''بہت دن ہوئے،آپ کی میری دانتوں سے بھی سلام دعا نہیں ہوئی......'' اس نے باپ کی کلائی پکڑ لی۔''اب آپ کو یاد رہے گا کہ مجھ سے سوال کرنے کا، جواب کہاں ملتا ہے۔اب جب آپ اس پر مرہم لگائیں گے، تکلیف سے رات بھر سو نہیں پائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دیبا پر طنز کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے......''

وہ اس سے اپنی کلائی آزاد کروانے کی ذرا برابر بھی کوشش نہیں کر رہے تھے۔

''میں کاٹ لوں گی والد! آپ جانتے ہیں مجھے......'' وہ دانت گاڑنے ہی والی تھی۔

''کاٹ لو میری دیبا! مجھے سفر پر جانا ہے۔جب جب اس زخم میں تکلیف ہوگی،تب تب تم مجھے یاد آؤ گی......''

''میں آپ کو ٹھیک طرح سے یاد آؤں......اس لیے میں ٹھیک طرح سے کاٹ......''

بات اور کام ادھورا رہ گیا......دور سے آتی گھنٹیوں کی آواز ایکدم سے بہت قریب آگئی۔والد نے جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے جدا کیا اور اس کے سر پر ٹکی چادر کو پکڑ کر گردن سے نیچے تک کھینچ دیا۔وہ چادر میں پوری چھپ گئی۔

Sumaira Hameed:Author

گھنٹیاں قریب آ چکی تھیں۔ دبیسا نے چادر کو ذرا سا پرے کرنا چاہا تو والد نے بھڑک کر اس کے جسم پر ضرب لگائی۔ چادر کی بکل پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چٹان کی طرح سخت ہو چکے تھے۔

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کچھ رحم کرو شہر کے لوگوں پر۔'' وہ ڈھال بن کر دبیسا کے سامنے کھڑے تھے۔

وہ دور گھاٹیوں سے کوڑھیوں کے ٹھکانے سے نکل کر آئی تھی۔ ہاتھ میں سہارے کی چھڑی تھی، جس کے اوپری کنارے پر گھنٹیاں بندھی تھی۔ وہ اپنے دو پیروں کے بغیر تو شہر کی طرف آ سکتی تھی لیکن ان گھنٹیوں کے بغیر نہیں آ سکتی تھی۔ ورنہ شہر کے لوگ اسے چیر پھاڑ ڈالتے......

ضعیفہ (بوڑھی) نے گہری آہ بھری۔ ''میرے والد کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ مجھے کوڑھ ہوا تو وہ جیتے جی مر گئے۔''

''میں نے تم سے کہا کہ تمہیں گھاٹی سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔'' والد کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔

''تم سب ایسے کیوں نہیں کہتے کہ ہمیں سانس لینا بھی چھوڑ دینا چاہیے؟ اس زمین کے ہر انسان، اس آسمان کے ایک خدا نے ہمیں چھوڑ تو دیا......اب کیا چاہتے ہو......؟؟''

بیٹھے، بیٹھے ہاتھ بڑھا کر اس نے والد کا ہاتھ دبایا کہ ذرا نرمی سے بات کریں۔ والد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''چلو دبیسا!'' وہ اسے گھسیٹنے لگے۔ انہیں ضعیفہ کے قریب سے گزر کر جانا تھا لیکن والد نے دوسرا لمبا راستہ اپنایا۔ وہ گھاٹی سے اتر رہے تھے۔

''دبیسا! لاجواب کلام کرتی ہو...... ہمارے لیے خدا سے کلام کیوں نہیں کرتیں؟''

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ ''آپ خود کیوں نہیں کر لیتیں...... میں ہی کیوں؟؟'' چادر ابھی تک سینے تک کھینچی ہوئی تھی۔ اس لیے چلا کر کہنا پڑا۔

''کچھ کو کچھ پر فوقیت ہوتی ہے دبیسا! تمہارے اطوار کہتے ہیں، تمہیں خدا کو راضی کرنے کے انداز آتے ہیں۔ تمہاری ایک ایک ادا بتاتی ہے، تمہیں ''خدا کی مرضی زمین پر لانا آتی ہے۔'' وہ ان کی سمت گھوم کر، بلند آواز سے بولیں۔

''کیا بات کرتی ہیں...... خدا سے میں نے مصری ریشم کے لیے کہا تھا، دورین کی شادی کے لیے۔ ابھی تک اس ریشم سے محروم ہوں۔ اب دورین کی شادی پر کیا پہنوں گی؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس دیں۔ والد کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا بازو اپنی گرفت میں لے کر وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔ اس لیے وہ گرتے پڑتے چل رہی تھی۔

''خدا کی مرضی کے آگے، ریشم کی کیا اوقات ہے دبیسا!''

''خدا کی مرضی زمین پر لانا کسے کہتے ہیں؟؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔

Sumaira Hameed:Author

''جب لے آؤ گی تو جان جاؤ گی...... ''چلا کر ہی جواب ملا۔

اس نے ایک ہاتھ سے چادر کا کونا اٹھا کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا...... بہت دور کھڑیں وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں......اور دونوں ہی ہنس دیں......

دو میں سے ایک کوڑھ زدہ تھی......اور ایک ہونے والی تھی......

ہماری دیبسا......وہ بہت جلد ان گھاٹیوں میں آ کر رہنے والی تھی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

ریشم کا مصری تھان عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔ سفید رنگ کا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے بازار میں ایک رومی عورت کو دیکھا تھا۔ اسے اس جیسا لباس بنوانا تھا۔ وہ مشکل سا تھا لیکن دورین سلائی کڑھائی میں بہت ماہر تھی۔ اس نے اسے کچی زمین پر اس لباس کا نقشہ بنا کر دکھایا تھا۔

''پر تم اس میں بہت عجیب نہیں لگو گی دیبسا......؟؟'' وہی دورین کی کام چوری کی عادت......

''میں نے تمہیں لباس بنانے کے لیے کہا ہے......منہ نہیں......''

''تمہارا یہ ریشم سمندر میں غرق کر آؤں گی۔ مجھ سے کام لے رہی ہو تو احترام بھی دو۔''

''نجانے کیوں، سارا شہر میرا تحمل آزمانے پر تلا رہتا ہے۔ نہیں لینا مجھے تم سے کوئی کام وام......'' اس نے منہ پھلا کر کہا، اپنا ریشم کھینچ لیا۔

''اچھا اچھا......کوشش کرتی ہوں......شاید تمہارا لباس ویسا ہی بن جائے جیسا تمہیں چاہیے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تمہارے چھوٹے بہن بھائی اس ریشم میں شہر کی گلیوں میں 'خاک' ہوتے ہوئے ملیں۔ میرا مطلب خاک آلود۔ معاف کرنا اس میں اپنی والدہ کو بھی شامل کر لو۔ میری چیزوں سے انہیں خاص چڑ ہے۔ وہی پسند کرتی ہیں جو میں کرتی ہوں۔ اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں کرتیں۔ یہ نا ہو مجھ سے پہلے وہ اسے پہن کر بازار خریداری کرنے چلی جائیں۔''

دورین نے دانت پیسے۔ ''والدہ سے کہوں گی وہ اسے پہن کر خریداری کرنے نہ جائیں، دیبسا کا گلا دبانے چلی جائیں۔''

والدہ خریداری کر کے، دیبسا کا گلا دبانے آ چکی تھیں۔ اور ریشم کو اٹھا کر دیکھ رہی تھیں' کیا نصیب ہیں تمہارے دیبسا! کیا ریشم منگوایا ہے تم نے۔''

دیبسا نے دورین کو گھور کر دیکھا۔ دورین نے والدہ کے ہاتھ سے تھان کھینچنا چاہا تو انہوں نے اسے پورا کھول کر شانے پر پھیلا لیا۔

''واہ! کمال کا کپڑا ہے۔ کوئی وزن نہیں۔ ایسی لیے مصری ریشم مشہور ہے۔ دیبسا کپڑا بچے تو......''

''کپڑا نہیں بچے گا خالہ! دورین کہتی ہے کپڑا کم ہے......مشکل سے ہی میرا لباس بنے گا......''

''دورین تو پاگل ہے......میں بناؤں گی تمہارا لباس......دیکھنا پھر کتنا کپڑا بچے گا......''

Sumaira Hameed:Author

''لیکن پھر آپ کی گردن نہیں بچے گی خالہ......'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

دورین نے کھانسنا شروع کر دیا۔ وہ پھر سے اپنی بیٹی اور ماں کی لڑائی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جلدی سے ریشم سمیٹ کر دیبسا کے ہاتھ میں دیا۔

''دیکھو اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میرے چھوٹے بہن بھائی شرارتی ہیں۔ اسے نقصان پہنچا دیں گے۔ تم لے جاؤ اور خولہ سے بنوا لو۔ میری طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی۔'' وہ اسے اشارے کہہ رہی تھی کہ ریشم سمیٹ لو جلدی سے۔ ابھی تو کھسکو۔

''میری بھی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ خالہ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟؟'' اس کا منہ پورا پھول گیا۔

''میری طبیعت تو ایسا اعلیٰ ریشم دیکھ کر باغ باغ ہو چکی ہے۔''

''پھر آپ اس باغ میں چہل قدمی کریں، میں پھر کبھی آؤں گی......'' خالہ ریشم چھوڑ ہی نہیں رہی تھیں۔ اسے کھینچنا پڑا۔ خالہ کا منہ بن گیا۔

وقت کے سمندر میں، دن کالبد پرواز کر رہا ہے......

شہر کا دلارا پرندہ ''دیبسا'' گھر کے درخت پر چڑھ کر پھل توڑ رہا ہے۔ ایک پرندہ درخت کی اونچی شاخ پر آ کر بیٹھا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پرندہ اجنبی تھا۔ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''شہر میں اجنبی پرندہ آیا ہے ماں! میں اس سے باقاعدہ ملاقات چاہتی ہوں۔'' پرندہ درخت سے اڑا تو وہ بھی جلدی سے درخت سے نیچے کود گئی۔ جھولی میں بھرے پھلوں کو ٹوکری میں انڈیل دیا......

''کس لیے دیبسا؟ اسے بھی کاٹنا ہے...... پرندوں کو تو چھوڑ دو......''

''شہر میں کوئی ایسی ماں نہیں جس کے لہجے میں طنز نہ ہو۔ میری ماں ان سب ماؤں کی سردار ہے......''

''شہر میں کسی کی بیٹی ایسی نہیں جو انسانوں کو پکڑ پکڑ کر کاٹتی ہو۔ میں خوش نصیب ماؤں میں اکیلی بدنصیب ماں ہوں۔'' ماں نے چڑ کر کہا۔

''والد کو مجھ پر فخر ہے......'' سر اٹھا کر وہ پرندے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''کاش میں بھی تم باپ بیٹی پر فخر کر سکتی۔ کیسی ڈھیٹ ہو تم...... ماں گھر کے کاموں میں ہلکان ہو رہی ہے۔ بیٹی اجنبی پرندوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔'' وہ رات کے کھانے کا انتظام کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔

''والدہ آپ نے سنا نہیں کہ اجنبی پرندے۔ فرشتوں کی صورت ہوتے ہیں۔ وہ خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں۔''

''اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد کرواؤ۔ یہ پیغام لایا ہے پرندہ......''

''فرشتے ایسی خراب باتیں نہیں کرتے......'' وہ گھر کی دہلیز سے باہر جا رہی تھی۔

''گھر کے کام کرنا خراب باتیں ہیں۔ جو تم لوگوں کی کھالیں ادھیڑتی پھرتی ہو؟''

Sumaira Hameed:Author

''وہ اسی کے مستحق ہیں......''

پرندہ شہر سے باہر جا رہا تھا۔ ہماری دیبا بھی شہر سے باہر جا رہی تھی۔ پھر وہ پرندے کے ساتھ ساتھ گھاٹیوں تک چلی گئی۔ پہلے پرندہ گھاٹیوں کی چوٹیوں پر اڑتا رہا پھر وہ ان گھاٹیوں کے اندر اتر گیا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ ایسا پیارا پرندہ کہاں چلا گیا۔ ایسی گندی اور بدبودار جگہ۔ والدنے اسے اپنی قسم دی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ کبھی اس طرف نہیں جائے گی۔ وہ کوڑھیوں کا ٹھکانہ ہے۔

وہ واپس گھر کی طرف آ رہی تھی کہ اسے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی ضعیفہ تھیں۔ گھنٹیوں کی آواز، ساری کائنات کی آواز بن گئی تھیں۔ وہ شہر کی دہلیز سے بچ بچ کر چل رہی تھی۔ دونوں ایک ہی راستے پر دو مختلف سمتوں میں تھیں۔ وہ شہر کی طرف، وہ شہر سے دور ویرانے کی طرف......

اچانک ضعیفہ نے اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر بھی گئی تھی۔ اس کے تکلیف سے بلبلانے کی آواز اس تک بھی آ رہی تھی...... ایک ساتھ کئی پتھر ضعیفہ کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ زمین پر بے کل ہو رہی تھی۔ اس کی کھال سے خون بہنے لگا تھا۔ دیبا بھاگ کر اس کی طرف آئی۔ کچھ دور، ایک درخت کی شاخ پر چڑھ کر بیٹھا خرطوم اسے دکھائی دے گیا تھا۔ حسب عادت شہر کے دوسرے بچوں کو اپنے ساتھ ملا کر وہ کوڑھیوں پر پتھر مارنے میں مصروف تھا۔ بچے اسے پتھر اٹھا اٹھا کر دے رہے تھے اور وہ تاک تاک کر مار رہا تھا۔ اس کا نشانہ اتنا پکا تھا، کہ ضعیفہ کی ناک، کان، آنکھ سے خون بہنے لگا تھا۔

وہ ان کی طرف آندھی طوفان کی طرح لپکی تو سب اس کی شکل دیکھتے ہی بھاگ گئے، لیکن خرطوم کو درخت سے اترنے میں وقت لگا۔

''میری شکل کی طرف دیکھو۔ پہچانتے ہو میں کون ہوں؟'' خرطوم کو گریبان سے گھسیٹ کر وہ زمین پر پٹخ چکی تھی۔ اور اب اس پر جھکی اس سے پوچھ رہی تھی۔

''تم اس شہر کی چڑیل ہو...... بلا ہو...... تمہیں کون نہیں پہچانتا۔'' وہ پشت کے بل پیچھے کھسک رہا تھا۔ دیبا نے اس کے ایک ہاتھ پر اپنا پیر رکھ کر دباؤ بڑھا دیا۔

''اس چڑیل کے دانت دیکھو......'' اس نے منہ کھول کر اپنے دانت انگلی سے ٹھونک کر پوچھا۔ ''نظر آئے......؟'' اب وہ اس کا ایک کان پکڑ کر شدت سے مروڑنے لگی تھی۔ خرطوم کا دم نکل رہا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔

''میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ تمہاری کھال نوچ لوں گی۔ دوبارہ تمہیں پتھر مارتے دیکھا تو گردن سے دبوچ کر، کنوئیں میں پھینک دوں گی۔ آگ جلا کر، اس پر الٹا لٹکا دوں گی۔ تمہاری کھال، تمہارا خون قطرہ قطرہ آگ پر گرے گا۔ کچھ سمجھ میں آئی بات......؟؟''

''معاف کر دو دیبا چڑیل...... معاف کر دو......'' بچے نے اپنا کان آزاد کروانا چاہا۔

''بلند آواز سے کہو کہ دوبارہ پتھر نہیں پھینکو گے......''

''میں دوبارہ کبھی کسی پر بھی پتھر نہیں پھینکوں گا...... دیبا میرا کان گیا...... دیبا میری جان گئی......''

Sumaira Hameed:Author

''ذرا رکو، تم پر ایک نشان لگا دوں۔ پتھر مار مار کر تم نے اسے خون سے نہلا دیا ہے۔ اب تم بھی دیکھو کہ جب کھال سے خون نکلتا ہے تو کیسا لگتا ہے...'' خرطوم کی کلائی آنکھوں کے سامنے لا کر اس نے اس پر اپنے دانت گاڑ دیے۔

بچے کی چیخ سے پہاڑی گھاٹیاں گونج اٹھیں......

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ''ابھی تو میں نے کاٹا ہی نہیں۔ تم چلائے کیوں؟؟''

اس نے زیادہ نہیں کاٹا تھا، ''بس کاٹا تھا'' اس بس کاٹا نے بچے کے جسم سے ''جان کا کانٹا'' نکال ہی دیا تھا۔ وہ زمین پر پشت کے بل کھسکتے ہوئے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ پھر اس نے مٹھیوں میں خاک بھری اور دیبا کی آنکھوں میں جھونک دی۔ جتنے پتھر ہاتھ آئے انہیں دیبا پر اچھالنے لگا۔ خاک نے دیبا کی نظروں سے کُھلے بھر کے لیے اسے اوجھل کر دیا تھا۔

وہ شہر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دیبا بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ گھاٹیوں سے اس کا پرندہ نکل آیا تھا۔ وہ دیبا کے سر کے اوپر اُڑ رہا تھا۔ دیبا کی چادر بھی تو اُڑ رہی تھی......

ایک پرندہ آسمان کے نیچے اڑ رہا تھا......

ایک پرندہ زمین کے اُوپر اڑ رہا تھا......

بھاگتا ہوا خرطوم بازار سے گزرا...... ہفتے کا دن کام سے آرام کا دن تھا تو آج بہت رش تھا۔ وہ بھیڑ کو ہاتھ سے دھکیلتا ہوا، چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔

''ماں...... ماں...... دیبا چڑیل میرے پیچھے لگ گئی ہے...... کوئی مجھے بچائے......'' وہ چلاتا جا رہا تھا۔ اس نے بازار میں کتنے ہی لوگوں کی چیزیں گرا دی تھیں۔

دیبا چڑیل نے شہر کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکے دیتی ہوئی خرطوم کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ اس کا خون پی لینا چاہتی تھی۔

''ماں...... کوئی مجھے بچائے...... دیبا...... دیبا...... وہ آئی......''

وہ چلاتا جا رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ اپنے گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دیبا کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتا تھا۔ ہوا سے اڑتی اس کی چادر، اس کے سر پر اڑتا ہوا پرندہ، اس کی آنکھوں کی تندی...... شہر والوں نے اس دن دیبا کو نئے ہی روپ میں دیکھا تھا۔ وہ خرطوم کو کھا جانا چاہتی تھی۔ تربوز والے چچا نے دیبا کو روکنا چاہا، وہ کچھ دور تک دونوں کے پیچھے بھاگے بھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

''ماں...... ماں......''

خرطوم کی چیخیں شہر کا سکون تباہ کر رہی تھیں۔ کتنی ہی عورتیں گھروں سے باہر نکل کر دیکھ رہی تھیں کہ کس ماں کو ایسے قیامت خیز انداز میں بلایا جا رہا ہے۔ بچوں نے اپنا کھیل کھیلنا بند کر دیا تھا۔ وہ سب کے کھیل تباہ کرتا، اپنے گھر کی سمت بھاگ رہا تھا۔

نہ بچہ رک رہا تھا، نہ دیبا......

''یہ مجھے مار ڈالے گی...... ماں......'' بچہ گھر کا دروازہ دھاڑ بند کر چکا تھا۔ ماں کے ہاتھ سے کوئی برتن گر کر ٹوٹا تھا۔

Sumaira Hameed:Author

وہیسا نے بند دروازے کو دھکا لگایا تو وہ کھلا نہیں۔ اس نے پوری قوت لگا کر ایک اور دھکا لگایا، دروازہ دھاڑ کھلا۔ دونوں پٹ وا ہو گئے۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ خرطوم جلدی سے ماں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ اس کی طرف لپکی......

"یہ کیا طریقہ ہے وہیسا! خرطوم کا دم نکلا جا رہا ہے..... کیوں بچے کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہو۔"

وہیسا کا اپنا سانس نکلا جا رہا تھا۔ پیٹ پھٹ پڑنے کو تھا لیکن اس نے سانس کو ایسے قابو میں رکھا کہ حالت ظاہر نہ ہو۔ وہ بدھ جنگ کرتی ہو تو اپنی کمزوری نہیں برداشت ظاہر کرتے ہیں۔ وہیسا کا لگایا تماشہ دیکھنے کے لیے آس پاس کی مائیں بھی گھر کے اندر آ چکی تھیں۔

"یہ اس کوڑھی کو پتھر مار رہا تھا....." اس نے لپک کر خرطوم کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ ماں نے اس کے ہاتھ کو بری طرح سے جھٹک کر پرے کیا۔

"وہ کوڑھی تمہاری ماں لگتی ہے؟ اچھا کیا پتھر مارے تو۔ کیوں آتی ہے وہ شہر کی طرف۔ ہم سب کو بھی کوڑھی کرے گی۔"

"وہ کوڑھی میری ماں ہوتی تو یہ اپنے پیروں پر بھاگ کر اپنی ماں کے پیچھے آ کر چھپ نہ جاتا......"

"اچھا! ایسی ہی شہہ زور ہو تم؟ سنا آپ نے یہ کیسے بات کرتی ہے؟؟" وہ گھر میں جھانکنے والوں مردوں اور گھر میں کھڑی عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

"ساری دنیا کو اکٹھا کر لیں، انہیں سنائیں، بتائیں کہ میں کیا کرتی ہوں لیکن میں ڈرتی نہیں ہوں۔ اس نے کوڑھی کو پتھر مارے۔ اس کی کھال پھٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ وہ پہلے ہی اتنی تکلیف میں ہے۔ اس نے انہیں اور تکلیف کیوں دی۔ میں اس کی کھال سے بھی ویسے ہی خون نکالوں گی......"

"اپنی کھال کا خون بچا کر رکھو وہیسا! مجھے بھی کم نہ سمجھنا۔ ایسی ہی ہمدردی ہے ان کوڑھیوں سے تو ان کے پاس جا کر کیوں نہیں رہتی۔ ساری دنیا میں بھاگتی دوڑتی پھرتی ہو۔ کیا تمہیں تمہارے باپ نے قسم نہیں دے رکھی کہ تم گھاٹیوں تک نہیں جاؤ گی۔ ایسی ہی نڈر ہو تو توڑ دو یہ قسم..... ایسی ہی بہادر ہو تو روز جایا کرو وہاں......"

"وہ تو کوڑھی ہیں، آپ کو کون سا مرض لاحق ہے؟ جو زبان بھی بدبو دے رہی ہے اور اخلاق بھی۔ یہ تو کوڑھ سے بھی زیادہ غلیظ ہے۔"

"تمہاری غلاظت کو سارا شہر جھیل رہا ہے وہیسا! تمہارا باپ دولت مند ہے تو کیا سارے شہر کو غلام بنا لے گا؟ دوبارہ میرے بچے کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ کاٹ دوں گی۔"

"اپنی زبان کیوں نہیں کاٹ لیتیں..... اپنے بچے کا ہاتھ کاٹیں......"

"وہیسا چڑیل تو کوڑھی ہو گی تو میں تجھ پر بھی ایسے ہی پتھر برساؤں گا۔ میں مار مار کر تجھے لہولہان کر دوں گا۔ تو نے میری بازو کاٹ کھائی ہے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا......" خرطوم میں ہمت آ گئی تھی۔

وہیسا طنز سے ہنسی، "مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ شہر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ بھیڑیے بھی رہتے ہیں۔ خدا کی اس زمین پر،

Sumaira Hameed:Author

انسانوں کی کھال میں، شیطان بھی رہتے ہیں۔''

''تو خود کسی شیطان سے کم ہے۔ سارا شہر تیرے شر سے پناہ مانگتا ہے......''

''میں آپ کی ''خیر'' سے پناہ مانگتی ہوں......'' وہ استہزائیہ ہنس دی۔ ''اس لاڈلے کو اپنی ممتا کی پناہ میں رکھنا خالہ! یہ اس گھر سے باہر جہاں مجھے نظر آ گیا، وہیں اس کی قبر بنے گی۔''

بچہ خوف سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہو گا۔ ''دبیسا تو کوڑھی ہو کر مرے......''

دبیسا دہلیز سے باہر اپنا پاؤں نکال چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا خرطوم!''

''تجھے کوڑھ سے لگے گا، جب تیری کھال بو بد دینے لگے گی۔ تیرا حسن نحوست زدہ ہو جائے گا۔ اس شہر کی حسین لڑکی جب اس شہر کی سب سے کریہہ صورت لڑکی ہو جائے گی۔ جب تیرا ٹھکانہ یہ شہر نہیں، کوڑھیوں کا شہر ہو گا۔ تب تو ڈرے گی۔'' ماں نے نفرت سے کہا۔

اس نے چوکھٹ کو ہاتھ سے دبوچ لیا۔ شہر کی سب سے حسین لڑکی، شہر کی سب سے شریر لڑکی...... دبیسا...... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خاموش ہو کر جا رہی تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

شہر کی سب سے حسین لڑکی، شہر کی سب سے شریر لڑکی...... ان کی دبیسا......

اسے شہر کی عورتیں زیادہ پسند نہیں کرتی تھیں لیکن شہر کے بڑے بوڑھے، اور دانا اسے پسند کرتے تھے۔ جو دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، وہ اگر باغی نہیں تو خلیفہ ہوتا ہے۔ والد کے سفر کے سب قصے اسے یاد تھے۔ شہر کے سب داناؤں کا وہ سر کھا چکی تھی۔ شہر میں اتنے گھر نہیں تھے جتنے اس کے کارنامے تھے۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا بچہ یا بچی ہو جو اس کے ساتھ کھیلا ہو اور اس کے ہاتھوں لہولہان نہ ہوا ہو۔ والد نے کبھی اناج، کبھی سکے، کبھی ریشم، کبھی بھیڑیں، کبھی دنبے، کبھی ظروف دے کر ان لڑائی جھگڑوں کو نپٹایا تھا۔ ماؤں کو وہ ناپسند تھی، ان ماؤں کی بیٹیوں کی اس میں جان تھی۔ مائیں انہیں دبیسا سے دوستی پر کوستیں تو وہ کہہ دیتیں......

''اس کا دل بہت صاف ہے...... وہ بہت اچھی ہے......''

''اس کے دانت اور زبان بھی بہت صاف ہے۔ کتنے نشان ہیں تمہاری کلائی پر اس کے دانتوں کے؟''

''ماں...... یہ تو اس کی محبت ہے......''

''محبت...... ایسے کاٹ کر؟؟''

''آپ کیا جانیں والدہ! اس کی طرف کیسا دل کھنچتا ہے۔ وہ جتنی بری لگتی ہے، اس سے کہیں اچھی ہے۔''

ماں نے کوئلے کریدنے کا گرم چمٹا خولہ کی کمر میں داغا۔ ''یہ میری محبت کا نشان ہے، دیکھنا دل کھنچا میری طرف؟''

اس کی جان کھنچ کر حلق میں آ گئی تھی...... وہ اپنی کمر مسل رہی تھی۔

اسے آنکھیں مسلنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی تھی اور وہ بستر پر گرتے ہی سو جایا کرتی تھی۔ اسے کوئی فکر یا کان نہیں رکھتی تھی۔ ماں کی

Sumaira Hameed:Author

خفگی پر وہ ایک صراحی کمر پر رکھ کر، ایک شانے پر سنبھال کر پانی بھرنے چلی جاتی تھی۔لیکن راستے میں ہی کوئی ایک صراحی توڑ لاتی تھی۔جب صراحی گرتی اور پانی ایک دم چھپک سے زمین میں جذب ہونے لگتا تو وہ ہنسنے لگتی۔

اس کی سہیلیاں اس کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔۔وہ ہاتھ جھلاتی ہوئی آ رہی ہوتی تھی اور پانی انہوں نے اٹھا رکھا ہوتا تھا۔وہ ماں کے کہنے سے کپڑے دھونے بھی چلی جایا کرتی تھی۔لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کپڑا پورا دھل بھی گیا ہو اور پھٹا بھی نہ ہو۔وہ پتھر پر کپڑے کو ایسے دے دے کر مارتی، کہ گھر واپسی پر ماں سے بچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ماں کپڑے اٹھاتی جاتی، ہائے ہائے کرتی جاتی۔

اس کی دو چھوٹی بہنیں اور چار بھائی تھے۔سب سے چھوٹا ماں کی گود میں تھا۔ایک نے کچھ وقت پہلے چلنا شروع کیا تھا۔سب بہن بھائی بس کھیلتے کودتے پھرتے تھے۔ماں اکیلی ہی گھر کے سب کام کرتی تھی۔گھر کے کاموں کے لیے دو مددگار تو تھے لیکن گھر اتنا بڑا، اور کام اتنے زیادہ تھے کہ کام ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔پھر اس کی عمر کی سب لڑکیاں گھروں میں کام کرتی تھیں۔

ایک بار اس نے ماں کی ڈانٹ سے بے زار ہو کر تنور میں روٹیاں لگانے کی کوشش کی تھی۔تنور گرم تھا...... تنور گرم ہی ہوتا ہے۔اسے تھوڑا ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے پانی انڈیل دیا تھا۔ماں چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی، تو وہ ڈر گئی۔

''وہ تنور گرم تھا بہت......اس لیے......''وہ واقعی میں ڈر گئی تھی۔

''تو اب تم پانی پر روٹیاں لگاؤں گی؟ تمہیں جادو بھی آتا ہے۔بدبخت......تو میرے ہی گھر کیوں پیدا ہوئی دبیسا۔''

اس نے روتی صورت بنا کر ماں کو دیکھا۔موٹے موٹے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے رو کر دکھایا ہو۔وہ روتی نہیں تھی۔ماں کے دل کو بڑا دھکا لگا، لپک کر اسے گلے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ گھر سے باہر بھاگ گئی۔

''مجھے بد بخت کیوں کہا......'' اسے ایک اس لفظ نے تکلیف دی تھی۔جاتے ہوئے وہ کہہ گئی تھی۔

اس رات کسی نے ماں کے ہاتھ سے بنی گرم روٹیوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔آگ پر بھنا نمکین گوشت، دنبے کے گوشت کا شوربہ......کسی نے اس طرف منہ تک نہ کیا۔سب منہ موڑ موڑ کر بستر میں جاتے رہے۔رات کے چراغ بجھ گئے لیکن کسی نے چپکے سے بھی اٹھ کر نوالے نہیں توڑے۔

''دبیسا کو بد بخت کیوں کہا......''

بچوں نے کہا۔والد نے کہا۔گھوڑوں کے رکھوالے نے کہا۔گھوڑوں نے کہا، مددگاروں نے کہا۔چاند نے کہا، رات نے کہا۔صبح کے پرندوں نے کہا۔ہوا نے کہا......سارے جہاں نے کہا......

''کیا میں ایسی ہی ظالم ہوں......''ماں تھک گئی۔عاجز آ گئی۔رو دینے کو ہو گئی۔

''ظلم تو اس بچی پر ہوتے ہیں اس گھر میں۔''والد نے منہ پھلا کر کہا۔

''میں دبیسا کو چچا کے گھر سے لے آؤں؟''چھ سالہ بھائی نے کہا۔

''نہیں! رہنے دو اسے وہیں۔ویسے بھی یہاں اس کا کون ہے۔کام کروا کروا کر بچی کو ہلکان کر دیا۔پانی بھر کر وہ لائے۔کپڑے وہ

Sumaira Hameed:Author

دھوئے۔کھانا وہ پکائے۔'' (صراحیاں وہ توڑے،لوگوں کو وہ کاٹے۔کپڑے وہ پھاڑے)

ماں نے حیرت سے دبیسا کے سگے باپ اور اپنے سگے شوہر کو دیکھا۔ایک ایک کر کے،اپنے سب سگے بچوں کو بھی۔اتنے سگوں میں ایک وہ سوتیلی تھیں۔

''کوئی مجھ بے چاری کی بھی تو فریاد سنے......'' ماں نے چادر کو سر پر درست کیا اور دبیسا کو لینے کے لیے چچا کے گھر کی طرف چل پڑیں۔

''میری بہت یاد آ رہی ہو گی والدہ......؟؟'' دبیسا نے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔

''ہاں میری بچی! سب نے مجھے تمہاری بہت یاد دلوائی......'' انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

چچا چچی نے آگے بڑھ کر دبیسا کا ہاتھ پکڑ لیا۔''ابھی اسے یہیں رہنے دو۔بچے بہت خوش ہیں اس سے۔''

''پر میرے بچے خوش ہیں نہ شوہر۔اگر یہ یہاں رہی تو میں اپنے گھر میں کیسے رہوں گی؟؟ اصطبل کے گھوڑے تک مجھے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔'' ماں بہت بے چاری بن گئی۔

دبیسا شوخی سے آنکھیں گھمانے لگی۔''ماں میں نے تنور گرم کرنا سیکھ لیا ہے......اب میں روٹی پکانا سیکھ لوں گی۔''

''نہیں میری بچی! تنور کا ذکر رہنے دو اب......بھول جاؤ کہ ہمارے گھر میں کوئی تنور ہوتا ہے۔''

وہ بھول گئی کہ کوئی تنور ہوتا ہے۔خولہ کی ماں نے یاد دلایا کہ شہر کی دوسری لڑکیاں اپنے باپ،بھائیوں کے لیے جبہ (عبا) بناتی ہیں۔اور تم......ہونہہ......وہ طنز سے ہنس رہی تھیں......تو اس نے ایک بار یہ زحمت بھی کر لی جب جبہ تیار ہو گیا تو اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے وہ خود ہی پہن لیا۔والد کا ہنس ہنس کے برا حال ہو چکا تھا۔

''لوگ ٹھیک کہتے ہیں دبیسا! تمہیں کوئی اور مخلوق بن کر پیدا ہونا تھا،لیکن......لیکن......دیکھو ایسے باہر نہ جانا،تمہیں نظر لگ جائے گی......''

اسے والد کی ہنسی پر بہت پیار آیا۔''آپ جیسے والد دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہیں۔'' اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کا آنکھوں سے لگا لیا۔

''تم جیسی بیٹی بھی تو نہیں......''

''اور مجھ جیسی بدقسمت عورت بھی......'' ماں نے پھر آہ بھری۔''دونوں باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو بگاڑ دیا۔میرا گھر بھی تباہ کر دیا۔ایک کی حرکتوں کے جرمانے بھرتے بھرتے،دوسرے نے گھر خالی کر دیا......'' ماں کو سب بھیڑیں،دنبے،گھوڑے،اناج،یاد تھے۔

ماں کو دبیسا کی سب حرکتیں بھی یاد تھیں......یہی دبیسا ہنستی مسکراتی ہوئی والد کے لیے بنایا جبہ پہن کر،خولہ،دورین سے ملنے کے لیے چلی گئی۔ان کی ماؤں نے منہ کھول کر،آنکھوں سے گھور کر اس کی تواضع کی۔

''یہ تم نے کیسا رومیوں جیسا لباس پہن رکھا ہے؟ عقل نہیں ہے کہ لڑکیاں کیسا لباس پہنتی ہیں۔'' خولہ کی ماں نے کہا

''میں اس لباس میں بے انتہا حسین و جمیل لگ رہی ہوں خالہ! آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ یہ خیال آپ کو کیوں نہیں آیا کہ آپ

Sumaira Hameed:Author

اپنے بھائی، والد یا شوہر کا چغہ پہن سکتیں۔''

''تو بتو بہ...... میں کیوں پہنوں گی مردوں کا لباس......''

''اگر آپ میری نظر نہیں اتار سکتیں تو مجھے کاٹ کھانے والی نظر سے بھی نہ دیکھیں......''

''میں تو تمہاری جرات پر حیران ہوں......'' دورین کی ماں بولیں۔

''میں اپنی جرات پر خوش ہوں۔ رومی عورتیں پہناوے میں نت نئی جدتیں دینے میں مشہور ہیں۔ انہوں نے میری یہ جدت دیکھ لی تو وہ مجھ پر فدا ہو جائیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ غش کھا کر گر پڑیں گی۔''

''پتا نہیں تم ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کہاں سے سیکھتی ہو۔ تمہارے باپ نے تمہیں کون سی دوا کھلا دی ہے کہ تم انسان بننے پر تیار ہی نہیں ہو......''

''اب خالہ حوروں کو بھی ''انسان'' بنتے دیکھا ہے......'' اس نے ایک ہاتھ کھڑا کر کے شان سے کہا۔ ٹھوڑی اٹھالی۔ اس کا حسن روشنی کی صورت اس کے چہرے سے پھوٹنے لگا۔ خالہ مبہوت تو ہوئیں۔ خولہ، دورین کا قہقہہ چھوٹا۔ وہ اس کی ادا پر فدا ہو گئیں۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو میسا! تم تو امنت کی کھال بھی اوڑھ لو تو کمال کر دو، یہ تو پھر چچا کا چغہ ہے۔''

''لیکن جی چاہتا ہے کسی انسان کی کھال اوڑھ لوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ مدد کرو گی؟''

خولہ کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ خولہ کی ماں، دورین کی ماں کے ساتھ مل کر میسا کی برائیاں کر رہی تھیں۔

''خالہ! ابھی تو شام ہونے میں وقت رہتا ہے، اتنی جلدی تندور گرم کر رہی ہیں آپ......؟؟''

خالہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگیں۔ البتہ وہ تینوں دبی دبی ہنسی ہنس گئیں۔

''تمہاری ماں کی آنکھیں شعلے اگل رہی ہیں۔'' اس نے خولہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''تمہاری زبان بھی تو آگ چنار بنی ہوئی ہے......''

''کیا میں سچ بھی نہ بولوں؟''

''کیا وہ اس سچ پر تیخ پا بھی نہ ہوں؟''

تینوں کا قہقہہ اتنا بلند تھا کہ خولہ کی ماں نے چمٹے کو گرم کیے بغیر ہی خولہ کی کمر پر داغ دیا۔ ان کے قہقہے شہر کی رونق میں مدغم ہو رہے تھے۔ وہ نیلے آسمان اور خاکی زمین پر، انسان کے باہمی دوست ہونے، ان کی معصومیت، زندگی کی خوشی اور زندہ دلی کی گواہی دے رہے تھے۔ زندگی کا ذائقہ چکھنے والا ہر انسان خوش نصیب ہے...... وہ بھی خوش نصیب ہیں......

☆ ...... ☆ ...... ☆

ریشم کا لباس تیار ہو چکا تھا۔ پیشانی پر سکوں جیسے چمکتے ستاروں کو پرو کر باندھا ہوا تھا۔ وہ ویسے ہی ایسی حسین تھی، اتنا اہتمام کیا تو ہر آنکھ کو دم بخود کر دیا۔

Sumaira Hameed:Author

''تمہارے والد نے کیا ہیرا چنا ہے تمہارے لیے دوورین! دیکھو تو ذرا..... میری بات مانو، ایسے ہیرے کو پھر سے راکھ میں دبا دو۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا دنبہ کھا گیا۔ اور کیسی شرافت سے پیٹ کے ڈھیر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ بے چارا دنبہ..... کس کنوئیں میں جا گرا..... ''جعفری سے لگ کر کھڑیں وہ باہر بیٹھے دلہا کو دیکھ رہی تھیں۔ سب سے آگے دبیسا کھڑی تھی۔ پیچھے دبیسا کی بگاڑی پوری فوج۔

''والدہ نے کہا تھا تمہیں شادی میں آنے سے باز رکھوں۔ اس لیے خاموش رہو۔ ویسے بھی سب میری بجائے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ دلہن سے زیادہ تم خوب صورت لگ رہی ہو۔ کیوں اتنا سج سنور کر آئی ہو..... کچھ شرم ہی کر لیتیں۔''

''شرم میں نے بہت کی، لیکن لحاظ نہیں کیا..... تمہارا.....'' وہ ہنس دی۔

''جا کر شرافت سے دلہا کو سلام کرو۔ اسے سلامی دو، اور دیکھو، کوئی شرارت نہ کرنا۔ ورنہ والدہ بہت خفا ہوں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے میں اس دنبے سے جا کر ملوں؟ میں، دبیسا اسے سلام کروں؟ اسے سلامی دوں..... آں..... خیال تو اچھا ہے..... آخا..... آج میں کچھ زیادہ ہی خوش ہوں.....''

''جاؤ نا دبیسا! خولہ کو بھی لے جاؤ.....''

اس نے گردن موڑ کر سب لڑکیوں کو دیکھا پھر آنکھ سے اشارہ کیا۔ سب دلہا کی سمت کھسکنے لگیں..... گھر کے کھلے احاطے میں، قندیلیوں کی روشنی تھی، کچھ جھلمل سجاوٹ، کہیں رنگین میز پوش..... دہکتے الاؤ..... ان پر پکتیں رانیں..... نمکین گوشت.....

دبیسا نے سر کے اشارے سے سلام کیا اور سامنے نشست پر بیٹھ گئی۔ دنبے کی بڑی بوٹی ایک کرتے، دلہا نے چونک کر دبیسا کو دیکھا۔

''تو وہ تم ہو.....؟؟''

''ہاں وہ تو میں ہوں..... پر تم کون ہو.....؟؟''

وہ گڑبڑا گیا ہے..... ''ہاں تو یہ تم ہی ہو۔ اس شہر کی سب سے خرانٹ لڑکی..... والدہ مجھے بتا چکی ہیں.....''

''آپ نے غلط سنا چچا دلہا۔ میں اس شہر کی سب سے نیک شریف لڑکی ہوں۔ مجھے تو ٹھیک سے بولنا بھی نہیں آتا۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا میں نے چلنا اور ہاتھ سے کھانا کھانا سیکھا ہے۔ دانت بہت کمزور ہوتے ہیں میرے۔ اس سے کچھ پہلے میں بس آں..... اوں کرتی تھی..... چھوڑیں..... آپ کے لیے یہ شربت لائی ہوں۔ رواج کے مطابق آپ کو یہ شربت پینا ہے۔''

سلامی کے سکے ایک ایک کر کے انہوں نے مخملی لحاف کے اوپر رکھ دیے تھے۔ سب لڑکیاں اس کے سر پر دائرہ بنا کر کھڑی تھیں۔ وہ اکیلی معاملات دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ماں نے اپنی ستارہ بیٹی دبیسا کو دیکھا۔ زیر لب کلام پڑھ کر اس پر پھونک ماری۔

چچا دلہا نے سلامی کے سکے سمیٹ لیے..... اب تو شربت پینا ہی تھا.....

''یہ..... آ..... آخ..... تھو..... میرا حلق..... یہ کیا ہو رہا ہے.....'' میٹھا شربت پورا پی لیا۔ پیالہ خالی کر دیا۔

''کچھ زدہ نہیں چچا دلہا! آپ دیکھنے میں پورا دنبہ اور آدھا سا چوہا لگتے ہیں تو سوچا کہ آواز بھی ویسی ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے

Sumaira Hameed:Author

شہر کا مطب بہت مشہور ہے۔ ایک بے ضرر سی دوا ڈالی ہے شربت میں۔ کچھ زیادہ نہیں ہوگا۔ دو تین خون کی الٹیاں ...... ایک آدھ سال جگر میں سوزش ...... یہی کوئی تین چار سال گلے میں خارش۔ اور بس کل ملا کر بیس بائیس سال خچر جیسی آواز ...... بس ...... زیادہ پریشان مت ہوں۔ آنکھیں تو اندر کریں چچا دلہا! آخ! ایسا بھی کیا ہوگیا گلے کو ...... کہیں پیڑ پودے تو نہیں اگنے لگے؟؟ جھاڑ جھاڑیاں؟ خولہ کون سی دوا دے دی تم نے چچا کو؟؟؟"

چچا دلہا اپنا حلق پکڑ کر زمین پر بھیڑ، بکرے، دنبے، چوہے، سب کی طرح الٹے پلٹے ہو کر پتا نہیں کیا کچھ اگل رہا تھے۔ اتنی بدبو آنے لگی تھی کہ مہمان ناگواری سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ اس کے کسی رشتے دار نے آ کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

"کہا تھا کم کھاؤ ...... تمہاری ہی شادی کا کھانا ہے ...... سب ناک ڈھانپ رہے ہیں۔"

لیکن ان سب نے منہ پر ہاتھ رکھے تھے قہقہے دبانے کے لیے ...... لیکن پھر وہ ...... وہ سب ...... ناکام ہوگئیں اور کھل کر ہنسنے لگیں ...... وہ کچھ ایسی شدت، ایسی دلبری سے ہنسیں کہ شادی واقعی میں شادی ہوگئی ...... ہر لڑکی دلہن ...... ہر لڑکا دلہا ...... جو جہاں، جس کام میں مصروف تھا وہ رک کر انہیں دیکھنے لگا ...... ان سب میں ...... سب میں ...... دمیسا کو خاص طور پر ...... وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہی تھی ...... اس کا حسن اس کے سر کا تاج ہو رہا تھا ......

اس زمین کا پھول ......

اس آسمان کا چراغ ......

اپنی سفید کلائی سے اس نے اپنی نم آنکھیں صاف کرنی چاہیں تو ایک دائی عورت جس کی پیشانی پر رومال بندھا ہوا تھا، نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ اس کا قہقہہ تو تھم گیا لیکن ہنسی نہیں تھمی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شادی میں شریک ایک خاتون اس کے بازو سے ریشم کو پرے ہٹا رہی ہے ...... شاید وہ اس کا لباس دیکھ رہی تھیں ...... اس کے لباس کی جدت ......

لیکن وہ ......

ایک دم خاتون نے اس کا بازو جھٹک کر چھوڑ دیا اور کتنے ہی قدم دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی ......

"اسے کوڑھ ہو چکا ہے ...... یہ کوڑھی ہو چکی ہے ......"

دمیسا نے اپنے بازو کو دیکھا ...... اس پر پڑے دھبوں کو اور پھر خاتون کو ......

سفید ریشم سیاہ ہو چکا تھا ......

اور ......

پیشانی پر چمکتے ستارے بے نور ...... (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆ ...... ☆ ...... ☆

Sumaira Hameed:Author

رب العالمین، رب الرحمن کے نام سے شروع۔

''ام الیقین''

☆ ...... ☆ ...... ☆

دبیسا نے ابد کا پیچھا کرتی ایک گہری سانس لی......

دانا عورت کی آواز، وہاں موجود ہر ذی روح کی سماعت تک پہنچ چکی تھی۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہوتا دلہا تک چونک کر سیدھا ہو چکا تھا۔ جتنے لوگ اس کے قریب کھڑے تھے، اس کی سہیلیاں، شادی میں شریک دوسری لڑکیاں، عورتیں اور کچھ بچے...... دو بچیاں تو اس کے لباس کے کونوں کے ساتھ کھیل رہی تھی...... وہ تک بدک کر پیچھے ہٹی تھیں......

ایک لمحہ لگا...... اور وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی......

اس نے اپنی دودھیا کلائی سے ریشم سرکایا اور اسے اوپر تک سرکاتی چلی گئی۔ وہ ان دھبوں کو دیکھنا چاہتی تھی، جو کھڑے کھڑے اسے نامراد بنا گئے تھے۔ وہ چند دن پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن وہ فکرمند نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو بھول بھی گئی تھی کہ اس کے جسم پر کہیں کوئی نشان موجود ہیں...... ایک کے بعد اس نے دوسرے بازو سے ریشم سرکایا...... سب اسے دیکھ رہے تھے۔

بد بخت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی میری دبیسا کو تو نے کوڑھی کہا۔'' کہیں بہت پیچھے سے ماں بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ ماں نے اس عورت کے منہ پر ہاتھ کا پنجہ ایسے پھینکا تھا جیسے اس کی کھال ادھیڑ لیں گی۔ عورت تکلیف سے بلبلا اٹھی، لیکن ماں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ وہ بار بار کہتی جاتی تھی۔ ''میں تیرا منہ نوچ لوں گی، میری دبیسا کو کوڑھی کہا۔''

''میرا منہ نوچنے کی بجائے اپنی بد بخت اولاد کا منہ نوچ پاگل عورت...... اس پر خدا کی پھٹکار پڑ چکی ہے......''

سانس لیتی دبیسا...... دل دھڑکاتی دبیسا...... اس نے تکلیف کا ایسا گھونٹ بھرا کہ اس کی روح بلبلا اٹھی......

''خدا کی پھٹکار......'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ بت بن کر کھڑی تھی ناں، کھڑی نہیں رہ سکی، گرنے لگی تھی۔ سہارے کے لیے کوئی نہیں بڑھا تھا۔ گرنے سے بچتے، ہاتھ روشنی کے الاؤ سے ٹکرایا۔ آگ نے اس کے ریشم پر اپنی چنگاری چھوڑی اور بجھ گئی...... ریشم بچ گیا۔ وہ ساری کی ساری جل گئی......

''اس پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے...... لعنتی ہے یہ......''

دبیسا نے یہ لفظ بہت بار سنے تھے...... آج پہلی بار اپنے لیے سنے تھے......

''بدنصیب عورت! کیسی اولاد پیدا کی ہے تو نے جس نے خدا کے عذاب کو دعوت دی ہے۔ کوڑھی ہو چکی ہے یہ فرشتے اس پر لعنتیں بھیج رہے ہیں۔ خدا سے غلاظت کا ڈھیر بنا چکا ہے۔ دور ہو جاؤ سب اس سے، کہیں تم بھی خدا کے عذاب کے مستحق نہ ٹھہرائے جاؤ۔

Sumaira Hameed:Author

اس پر بھیجی جانے والی لعنت کے چھینٹے ہم پر بھی نہ پڑ جائیں۔اس کے ناپاک جسم،گندی روح کا خمیازہ تم سب کی جانوں پر بھی نہ آ جائے۔

جو پہلے ہی اس سے دُور ہو چلی تھیں،وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اور دور ہونے لگی تھیں۔خولہ اور دورین...... وہ سسک رہی تھیں اور منہ ڈھانپ رہی تھیں۔اس نے گردن گھما کر دیکھا،وہ اس سے دور...... بہت دور...... ہوتی جا رہی تھیں۔اس کی آنکھیں ایکدم سے نم ہو گئیں۔وہ کبھی روئی نہیں تھی...... لیکن...... لیکن اب اس کا جی چاہا کہ اتنا روئے کہ سارے جہاں کو اپنے آنسوؤں میں بہا دے۔......

''توبہ توبہ!دیکھ لو سب اسے...... یہ لڑکی تم پر عذاب لانے والی ہے۔میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔مجھے یہ شہر،اس بدبخت کی وجہ سے تباہ ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔اس سیاہ کار کے گناہ کا عذاب بہت جلد اس شہر پر کالی آندھی بن کر،ہر جان پر بھاری پڑنے والا ہے۔سب مل کر توبہ کرو۔اگر تم نے توبہ نہ کی تو ایک ایک کر کے تم سب کوڑھی ہونے لگو گے...... اپنے گناہوں کے لیے رووٗ،گڑگڑاؤ اور کوڑھ سے پناہ مانگو۔اس کے گناہ کا خدائی قہر ہم سب کے سروں پر منڈ لانے لگا ہے...... اے خدا ہمیں اپنی پناہ میں رکھ...... اے خدا......''

ماں اپنے ہوش کھو رہی تھی۔بچوں میں کھیلتا اس کا بھائی،وہ اپنا کھیل چھوڑ کر ماں کا پلو کھینچ کھینچ کر پوچھ رہا تھا۔

''ماں...... ہماری دبیسا کوڑھی ہو گئی...... ماں؟...... ماں؟ کیا ہماری دبیسا...... ماں؟''

سفید ریشم ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا......

ماں سے جواب نہ پا کر وہ اس کی طرف آیا تھا۔''دبیسا...... دبیسا......''وہ رونے لگا تھا۔اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔

اس نے اپنا کوڑھی ہاتھ،بھائی سے الگ کیا۔وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے گیلے گال پونچھنا چاہتی تھی۔جھک کر اس کا منہ چومنا چاہتی تھی۔لیکن اب وہ یہ نہیں کر سکتی تھی...... کیونکہ اب تو وہ کوڑھی ہو چکی تھی...... کیونکہ...... کیونکہ...... اب وہ صرف دبیسا نہیں رہی تھی......

''دبیسا...... بولو نا...... والد کی جان،بولو نا......''وہ سسک رہا تھا۔

والد کی جان...... اب ان کی جان لینے والی تھی......

''دبیسا...... میری پیاری دبیسا......''اس کا رونا کتنی جلدی ہچکیوں میں بدل چکا تھا...... بے چارہ کوڑھ سے کیسا خوفزدہ تھا۔

''ہاں...... میں کوڑھی ہو چکی ہوں......''سارا شہر جو کبھی اس کی جرات کا گواہ رہا تھا،اس وقت اس کی''بزدلی''کا گواہ ہوا تھا۔اس کی کپکپاتی کمزور آواز نے اس کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔اس کے چٹان حوصلے مسمار ہونے لگے تھے......

''دبیسا...... دبیسا......''وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔وہ تو دبیسا ہے۔وہ کوڑھی کیسے ہو سکتی ہے۔وہ اس کی بہن ہے۔والد کی لاڈلی ہے۔حسن کی دیوی ہے۔وادی کا پرندہ ہے۔زمین کا پھول ہے...... وہ کیسے...... وہ کیسے...... لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔وہ اس کے نام کی تکرار کیے جا رہا تھا۔پھر وہ اس سے لپٹ گیا۔وہ چھوٹا تھا لیکن کوڑھ اور کوڑھی کے نصیب سے اچھی طرح سے واقف تھا۔وہ رو رہا تھا کہ شاید یہ نصیب بدل جائے۔اس کی دبیسا کوڑھی نہ رہے۔دونوں بازو سے اسے تھام کر وہ یہ تسلی کر رہا تھا کہ اس کی دبیسا کہیں جانے والی نہیں...... کہیں نہیں...... گھاٹیوں پر خدا کا قہر برسے،آسمان کی بجلی گرے۔اس کی دبیسا...... اس کی دبیسا...... وہاں کیوں جائے...... زمین دلدل ہو،اور گھاٹیاں اس میں غرق ہوں،اس کی دبیسا...... اس کی دبیسا......

Sumaira Hameed:Author

دیبا نے اسے خود سے الگ کیا اور کہا کہ وہ ماں کو سہارا دے اور گھر لے جائے۔ لیکن اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ ہتھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑتا جاتا تھا۔ شدت سے ہچکیاں ابھرتا جاتا تھا...... اس نے ماں کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کی بجائے شادی کے گھر سے دُور بھاگ جانا چاہا...... والد کے پاس......

''بابا...... ہماری دیبا...... وہ...... ہماری دیبا......'' شہر کی گلیوں میں بھاگتے، باپ کو پکارتے، دیبا پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر دیتے وہ اپنے غم پر دہائی مچاتا سرپٹ بھاگتا جا رہا تھا......

اس رات، سارے شہر نے ''ہماری دیبا، ہماری دیبا'' کی پکار سنی تھی۔ اس رات سارا آسمان گواہ بنا تھا کہ جب وہ زمین والوں پر گرتا ہے تو کیسا محشر برپا ہوتا ہے۔ اس رات زمین نے اپنی جڑیں کھوکھلی کر کے جانا کہ جب وہ خود کو تنگ کرتی ہے تو زمین والوں پر کیا گزرتی ہے۔

شادی کی تقریب میں یونانی حسن کی دیوی...... دیبا...... کھڑے کھڑے کوڑھی ہو چکی تھی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

''اسے کوڑھ نہیں ہے۔ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' والد کے لہجے میں ایسی تندی اور تختی تھی کہ شہر کے معززین نے سہم کر پہلو بدلے تھے۔ وہ خائف ضرور ہوئے تھے لیکن ارادے کے پکے تھے۔ وہ سب مل کر والد کو یہ یاد دلانے آئے تھے کہ جلد سے جلد دیبا کو گھر اور شہر سے نکال دیا جائے۔ ہوا اتنی جلدی نہیں پھیلتی، جتنی جلدی یہ بیماری پھیلتی ہے۔ اس لیے وہ ''بیماری'' کو اس کی اصل جگہ روانہ کریں۔

''ہم اندھے تو نہیں ہے۔'' ایک نے تنفر سے کہا۔ وہ اس انسان کی کم عقلی پر حیران ہوا تھا۔

''اندھے ہو یا بہرے، میں نے کہہ دیا ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، میری دیبا کا نام لیا تو میں زبانیں کاٹ لوں گا۔''

''کس کس کی زبان کاٹو گے؟ کب تک کاٹو گے؟ تمہیں لگتا ہے کہ تم اس کا کوڑھ چھپا کر رکھ لو گے؟ یہ ناسور ہم یہاں اپنی بستیوں میں پھیلنے دیں گے؟ کس لیے؟ سارے شہر میں وبا پھیل جائے گی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا شہر کوڑھی ہو کر مرے۔''

''اسے یہ بیماری نہیں ہے تو وبا کیسے پھیلے گی......'' وہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھ رہے تھے۔

''تم کسے دھوکا دے رہے ہو؟ خود کو یا ہمیں؟ ٹھیک ہے تو بلاؤ پھر دیبا کو...... ہم خود دیکھ لیتے ہیں......''

''وہ کسی کے سامنے نہیں آئے گی۔ آپ سب کو یہاں سے جانا ہوگا۔''

''ہم تم سے نرمی سے بات کر رہے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنی من مانی کر سکتے ہو۔ اس شہر کے کچھ قانون ہے، اصول ہیں۔ ہم ایک کے لیے پورے شہر کو کوڑھ کا تحفہ نہیں دے سکتے۔ جان حلق میں ہی کیوں نہ اٹکی ہو، انسان اپنی غلاظت نہیں کھا سکتا۔ تم بھی اس غلاظت کو نہ چاٹو...... جلدی کرو......''

''کیسا شہر؟ کون سے لوگ؟؟ میں سارے شہر کو آگ لگا دوں گا...... نکلو یہاں سے......''

''تو تم نے مان لیا کہ وہ کوڑھی ہو چکی ہے؟؟؟''

Sumaira Hameed:Author

''ہاں ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ہاں ہو چکی ہے۔۔۔۔۔اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔'' وہ ایک ایک کو دھکے دے کر گھر سے نکل جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ایک نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی شدت پسندی کو روکنا چاہا۔

''تین سال پہلے شہر کے معززین میرے گھر بھی آئے تھے۔میری گیارہ سالہ بہن کے لیے۔۔۔۔۔ان لوگوں میں سے ایک تم بھی تھے۔تم نے کہا تھا کہ ہر بیماری کا ایک علاج ہوتا ہے،اس بیماری کا علاج گھاٹی ہے۔تم نے کہا تھا کہ یہ بیماری ہم پر خدا کا عذاب ہے۔مخلوق کو اس عذاب سے بچانے کے لیے ہمیں اپنے دلوں پر پتھر رکھنے ہوں گے۔میں نے وہ پہاڑ سا پتھر سینے پر رکھ لیا تھا۔میرا باپ اس کے غم میں مر گیا،میری ماں اس کے لیے بستر سے جا لگی تھی۔لیکن ہم نے اپنے سینوں سے پتھر نہیں کھسکایا تھا۔مجھے بھی اپنی بہن سے اتنا ہی پیار تھا جتنا تمہیں اپنی دبیسا سے ہے۔وہ ڈیڑھ سال گھاٹیوں میں رہی اور پھر مر گئی۔لیکن ہم نے اس کی میت اسی وقت اٹھائی تھی جس وقت وہ گھاٹیوں میں جا رہی تھی۔وہیں ہم نے اس کی قبر کھود دی تھی۔میں نے وہی کیا جو اس شہر کا قانون تھا۔تمہیں بھی وہی کرنا ہوگا۔کوڑھی آبادی میں نہیں رہ سکتا۔۔۔۔۔بس۔۔۔۔۔اور تم یہ قانون نہیں توڑ سکتے۔''

والد کے ہاتھ کپکپا گئے تھے۔''میری دبیسا کو چھوڑ دو۔میں اسے گھر کی کوٹھری میں بند کر دوں گا۔وہ کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔میں اسے کوٹھری میں زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گا۔''وہ رو دیے تھے۔رات کو ہچکیاں لیتے،دکھ سے بلبلاتے بچے کی طرح،جو انہیں دیکھتے ہی ان سے لپٹ گیا تھا اور بس روتا ہی جاتا تھا۔

''تاکہ سارے شہر پر عذاب نازل ہو جائے؟تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔اس پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے۔وہ اپنے گناہ کی پکڑ میں آ چکی ہے۔اس کی روح ناپاک ہے۔وہ بدبخت ہے۔۔۔۔۔ہم ایسے بدبخت انسان کو شہر میں نہیں رکھ سکتے۔۔۔۔۔''

''میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔''انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''تمہیں کوئی اپنے شہر کی حدود میں گھسنے نہیں دے گا۔اپنے لیے زندگی کو پہاڑ نہ بناؤ۔جو کہا ہے وہ کرو۔ٹھیک ہے تم باپ ہو لیکن یہ تو سوچو جب خدا نے ہی اس پر لعنت بھیج دی تو تمہارا دل کیوں پگھلا جا رہا ہے۔یاد رکھو کہ خدا اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔لیکن جب وہ کسی پر بدبختی بھیجتا ہے تو وہ انسان اسی بدبختی کا مستحق ہوتا ہے۔کوڑھ ہی خدا کی بدبختی کی نشانی ہے۔تمہیں ایسے بدبخت انسان سے دل نہیں لگانا چاہیے۔توبہ کرو۔۔۔۔۔خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔۔۔۔۔معافی مانگو کہ وہ تمہیں معاف کر دے جو ایسی گناہ گار بیٹی کے باپ بنے۔''

''بکواس بند کرو اپنی،میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔۔۔۔۔''وہ چلا اٹھے تھے۔گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ان پر پھینکنے لگے تھے۔

وہ اوٹ میں کھڑی،سب دیکھ اور سن رہی تھی۔والد دیوانے ہو چکے تھے۔ماں کی کل رات سے عجیب حالت تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ بحر مردار سے اپنی سانسوں کی ڈور ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔گھر میں دو بیمار والد اور والدہ اور ایک روگی،دبیسا موجود تھے۔لیکن ان بیماروں کی بیمار پرسی کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔یہ وہ بیماری تھی،جس کی بیمار پرسی کرنے والوں کو بھی بدبخت سمجھا جاتا ہے۔ایسی دہلیز بھی پار نہیں کی جا سکتی تھی جہاں کوئی کوڑھی رہتا ہو۔اس کی سہیلیاں تک نہیں آئی تھیں۔آس پاس کے ہمسائے اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔جب تک دبیسا گھاٹیوں میں نہیں چلی جاتی تھی،وہ اپنے گھروں میں واپس آنے والے نہیں تھے۔

Sumaira Hameed:Author

کل سورج غروب ہوا تھا تو سب کچھ ٹھیک تھا، آج کا سورج طلوع ہونے سے پہلے سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس کی خوش قسمتی، بدبختی میں بدل چکی تھی۔ اس کا حسن کریہہ ہو چکا تھا...... نام ''کوڑھی'' اور وجود ''لعنتی''...... رات کے تین پہر ہی بیتے تھے کہ سارا شہر جو اس کے حسن کے گن گاتا تھا، اس کے گناہ پر گالیاں دے رہا تھا۔ اس کی شرارتوں سے محظوظ ہوتا تھا وہی شہر اس کی موجودگی سے غیر محفوظ ہونے لگا تھا۔ مرد اسے عقل و شعور کی دیوی کا لقب دیتے تھے، وہی مرد اسے گناہوں کی پوٹلی کہہ رہے تھے۔ لڑکیاں اس کی جرات پر فدا تھی، وہی لڑکیاں اس کے سائے سے بچ کر دور کھڑی تھیں۔

ایک لمحہ لگا...... اور سب ختم ہو گیا......

دنیا کی کوئی طاقت اس کے کام نہیں آسکی تھی۔ جب باپ کا اختیار، ماں کا پیار ہی کسی کام کا نہیں رہا تھا تو باقی دنیا کی کیا حیثیت تھی؟ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا تو پھر کون بچا سکتا تھا؟ اصل طاقت ور کون تھا؟؟؟ کس کے پاس تھا ہر جان کی تقدیر کا اختیار......؟؟

☆ ...... ☆ ...... ☆

والد اتنا رو چکے تھے کہ وہ ان کی طرف دیکھتی تھی تو اسے اپنے گناہ گار ہونے کا یقین ہو جاتا تھا۔ وہ جو والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی، ان کے لیے انگارہ بن چکی تھی۔ گھر کی ایسی حالت تھی جیسے وہاں ایک ساتھ کئی لوگ مر چکے ہوں۔ ان کی میتیں کھلی پڑی ہوں اور کوئی دفنانے کی ہمت نہ کرتا ہو۔

''میں آج رات تمہیں یہاں سے لے کر نکل جاؤں گا۔ ہم کہیں اور جا کر رہیں گے۔'' اس کے ہاتھ چومتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے

''اور ماں؟''

''تمہاری ماں کمزور نہیں ہے، وہ اکیلی رہ سکتی ہے۔ ہم ویرانوں میں رہ لیں گے دبیسا! لیکن یہاں نہیں رہیں گے۔''

''ویرانوں میں ہی رہنا ہے تو...... تو...... والد...... مجھے وہیں جانے دیں جہاں......''

''تمہیں اپنے باپ کی جان کی قسم ہے دبیسا! تمہیں میری قسم ہے میری آنکھوں کے نور......'' وہ روتے روتے کتنا ہلکان ہو چکے تھے۔ ''یہ نہ کہنا، کبھی نہ کہنا۔ میں کیسے سہوں گا...... ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہارے لیے کوڑھی کا لفظ نہیں سن سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے میں اپنے کانوں میں سیسہ انڈیل لوں۔ اپنے باپ پر رحم کرو دبیسا! ضد نہ کرنا، بس میں جو کہوں وہ کر لینا۔''

''آپ خود کو ہلکان کر رہے ہیں والد! مجھے اب اس زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔''

''پھر میں تمہارے لیے آسمانوں میں پناہ ڈھونڈ لوں گا۔''

باپ کی ایسی بات نے دبیسا کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ''میرے ساتھ رہ کر آپ بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکیں گے۔''

''تمہارا باپ اس بیماری سے ڈرے گا؟؟ جو خوف تھا وہ تو پورا ہو گیا۔ اب اس بیماری سے کیا ڈرنا دبیسا۔''

''پھر اس بیماری کے نصیب سے بھی نہ ڈریں والد! میں لعنت کی مستحق تھی، مجھے لعنت مل گئی۔ میں جہاں بھی گئی، میرے ساتھ یہی ہوگا۔ مجھے بدبخت کہا جائے گا، خدائی عذاب کا طوق سمجھا جائے گا۔ مجھے پتھر ماریں جائیں گے۔ میری پیشانی دیکھیں، اس پر روشن چاند،

Sumaira Hameed:Author

گرہن کھا چکا ہے۔ میری آنکھیں دیکھیں، یہ اپنا نصیب پڑھ چکی ہیں۔آپ جانتے ہی ہیں کہ لوگ خدا سے محبت کرنا تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن کوڑھی سے نفرت کرنا نہیں۔ جسے خدا دھتکارے، اسے دنیا بھی ضرور ہی دھتکارتی ہے۔ضد نہ کریں۔اپنے حصے کی بدبختی مجھے بھگت لینے دیں۔''

''خدا میری دبیسا پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے.....''وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

وہ اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔اس نے بڑھ کر باپ کے آنسو نہیں پونچھے تھے،ان کے ہاتھ کی پشت کو نہیں چوما تھا۔اس نے دنیا کو خود سے دور کرنے کی ابتداء اپنے باپ سے کی تھی......اس نے ان سے فاصلہ رکھ لیا تھا......

''دروازہ کھول لعنتی کے باپ......دروازہ کھول......''گھر کے باہر شور اٹھا تھا۔شام گہری تھی،رات ہونے ہی والی تھی۔ماں بے چاری نے گھر میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ان میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر اپنے شوہر کے آنسو ہی پونچھ دیتیں،روشنی کا انتظام کیسے کرتیں۔ان کا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ بستر پر پڑے پڑے مر جائیں......آنکھیں بند کریں تو دوبارہ کھول نہ سکیں......

''کیا لینے آئے ہو یہاں......؟؟''وہ دروازے کے سوراخوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔وہاں ایک عالم کھڑا تھا۔

''بہت سن لی ہے ہم نے تمہاری۔نکالو اسے باہر اور خود بھی نکلو۔دفع ہو جاؤ یہاں سے۔اپنی بدنصیبی میں ہمیں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔شہر پر عذاب آنے لگا ہے۔ہم نے اپنے رب کی حکم عدولی کی ہے۔شہر میں آگ لگنا شروع ہو چکی ہے،سعید کا گھر شعلوں سے بھڑک رہا ہے۔ہم نے ایک سیاہ کار کو پناہ دے رکھی ہے۔سارا شہر جل کر راکھ ہو جائے گا۔جس سے خدا بےزار ہو چکا ہو،ہم اس سے لگاؤ نہیں رکھ سکتے۔پاگل انسان،اپنی دوسری آل اولاد کے بارے میں سوچ۔تو چاہتا ہے کہ ان سب پر بھی عذاب آئے۔''

''اپنی مصیبتوں کا الزام تم میری بیٹی پر کیسے لگا سکتے ہو،کم عقلوں......''والد سسک دیے۔

''دروازہ کھول دو،ورنہ ہم توڑ دیں گے۔تمہارا بہت لحاظ کیا ہے ہم نے۔رات تک ہم پر نجانے کتنی اور مصیبتیں آچکی ہوں گی۔ہم خدا کو اور ناراض نہیں کر سکتے۔''

''باپ کے دل پر وار کر کے تم خدا کو راضی نہیں کر سکتے۔توڑ دو دروازہ۔میں اسے کھول کر اپنی بیٹی کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا......''وہ لپک کر دبیسا کے قریب آئے۔

دروازے پر دھکے پڑنے لگے تھے۔ بستر سے نکل کر گرتی پڑتی ماں یہ منظر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔اسے رونے کے سوا کوئی چارہ ہی دکھائی نہیں دیتا تھا۔وہ اتنی بےبس تھی کہ خود کو جھوٹی تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔والد جلدی جلدی چند ضروری چیزیں سمیٹ رہے تھے۔وہ اسے اپنے ساتھ شہر سے باہر لے جانا چاہتے تھے۔

''ہم پچھلی دیوار کود کر نکل جائیں گے۔''وہ اس کا ہاتھ کھینچ رہے تھے۔وہ دیوار کی طرح کبھی نہ ملنے کے لیے کھڑی تھی۔

''نہیں والد!یہ ہجرت ہمیں راس نہیں آئے گی۔مجھے بھی وہی نصیب بھگتنا ہوگا،جو شہر کے دوسرے کوڑھی بھگت رہے ہیں۔''

''اپنی زبان کاٹ لو دبیسا!میرے سامنے خود کو کوڑھی نہ کہو۔''

Sumaira Hameed:Author

اس نے اپنے باپ کی بے پناہ محبت کو پوری شدت سے محسوس کیا......اس شدت کی محبت اس کے باپ کی ہے تو......تو......خدا اس سے کیسے نفرت کرسکتا ہے......وہ کیسے اسے دھتکار سکتا ہے......شدت غم سے کانپتے والد کے وجود میں الاؤ دہک رہے تھے۔ رات ہی رات میں، نہ جانے کیسے ان کی ساری ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی۔ سیاہ بال تھے بھی تو وہ روپوش ہو چکے تھے۔ ماں کی حالت پر حشر محشر تھا۔ رات ہی رات میں، چھوٹے بھائی نے بڑھاپے کی چال سیکھ لی تھی......گھر کی سانس، باس دینے لگی تھی۔

گھر کے دروازے پر پتھر پڑ رہے تھے۔ باپ نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ اسے پچھلی دیوار تک لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتے تھے۔ تنگ پڑ چکی زمین سے بلند کر کے، وہ اسے کھلے آسمان پر اٹھا لے جانا چاہتے تھے......کہ......کہ دیبا نے اپنا ہاتھ ان سے آزاد کروا لیا......اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''میں جا رہی ہوں......والد کے گھر پر پتھر نہ برسائیں۔'' چوکھٹ کے درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے اطمینان سے کہا۔

''تمہارا باپ انہی پتھروں کی زبان سمجھتا ہے......'' کسی نے طنزیہ کہا۔

''وہ نا سمجھ ہیں، آپ جیسے سمجھداروں سے ان کا کیا مقابلہ۔ فکر نہ کریں، میری وجہ سے اب آپ پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔ لعنت کا طوق مجھے مل چکا ہے، اس طوق کا عذاب بھگتنے میں جا رہی ہوں۔ میں کوڑھی ہو چکی ہوں اور کوڑھی بن کر رہنے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

بدبخت دیبا......

لعنتی دیبا......

ناپاک دیبا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

بدبخت......لعنتی......ناپاک......

حدی نے زیر لب نام دہرائے تھے۔ زمین پر اتر کر چلتے ہوئے اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اسی زمین پر کسی کو ذلت سے گھسیٹا گیا ہے۔ اس کے حصے میں جتنا سکھ آیا ہے، اس سے کہیں زیادہ ماضی کے انسان کے حصے میں عذاب آیا ہے۔

وہ چلتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اسے لفظ لعنت سے سخت نفرت تھی۔ اسکول میں اس کی پہلی لڑائی اسی ایک لفظ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ لڑائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کلاس فیلو کے گھر پہنچ گئی تھی۔ شام کو کھیلنے کے لیے وہ پارک آئی تو اس نے مار مار کر اس کا حشر خراب کر دیا تھا۔ ماما، پاپا، اسکول کا بورڈ، اس بچی کے پیرنٹس، سب حیران تھے کہ وہ اتنی تشدد پسند کیوں ہو رہی ہے۔ کس چیز نے اسے اتنا بجڑ کا دیا ہے......

لعنت......پہلی بار شیطان پر بھیجی گئی تھی۔ وہ اس لفظ کا مستحق قرار پایا تھا۔ انسان اپنے لیے اس لفظ کے طوق پر بلبلا اٹھتا ہے۔

''انہوں نے دیبا کو لعنتی کہا؟؟'' وہ فرشتے سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں......کیونکہ سب کا ماننا تھا کہ یہ بیماری لعنت ہے......''

Sumaira Hameed:Author

''کیا کوئی بیماری اپنے ساتھ لعنت بھی لا سکتی ہے؟؟'' اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''کوڑھ لائی تھی...... لعنت، ملامت، تہمت، دھتکار...... انسانوں کی نفرت کا عذاب...... ذلت، تنہائی اور بدنامی......''

اس کی آنکھیں اتنی نم ہو گئیں کہ فرشتہ ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آج تک کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ وہ کتنی لعنتوں سے محفوظ رہی ہے۔ کتنی زحمتیں ہیں جو اس زمانے کے انسان کے لیے رحمتوں میں بدل دی گئی ہیں۔ کانٹا چبھنے پر بلبلا اٹھنے والے انسان نے کبھی جانا ہی نہیں چاہا کہ کتنے ہی کانٹے اس کی راہ سے پہلے ہی چن لیے گئے ہیں۔

شیشے کی کرچیوں کا ڈھیر سمیٹا جا چکا تھا۔ ماما، پاپا اس کے پاگل پن سے پریشان تھے۔ وہ ان کے پاس گئی اور اس نے باری باری دونوں کے ہاتھ چومے۔ وہ کبھی ان کی محبت، ان کی فکر، ان کی موجودگی کا شکریہ ادا نہیں کر سکی تھی۔ وہ یہ کبھی جان ہی نہیں پائی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور عظیم احسان ماں باپ کی صورت میں کیا گیا ہے۔ باپ کی شفقت، اور ماں کی محبت، کسی نعمت کو ان دو نعمتوں کے برابر کا درجہ نہیں دیا گیا۔

''تم اپنے ساتھ کیا کرنے جا رہی تھیں حدی؟'' ماما رو رہی تھیں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔

''میں کم عقل ہوں اور جلد باز بھی......؟'' وہ مسکرا رہی تھی۔

فون لے کر اس نے اپنی فرینڈز کو کالز کرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ سب اس کی بیماری کا سن کر بھاگی چلی آئی تھیں۔ وہ اس کے لیے خوش اُمیدی لائی تھیں، لعنت نہیں۔ پھر وہ اپنے کلاس فیلوز اور لائم سے بات کرنے لگی تھی، جن کے ہاتھ پتھروں سے مبرا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے ان سب لوگوں کو جو اس کی بیماری کا سن کر پریشان ہوئے تھے کو کال کی، ان کا شکریہ ادا کیا، کہ وہ اسے خدا کے عذاب کی گالی دینے سے باز رہے تھے۔

رات اسی طرح گزر گئی...... نئے دن کا سورج اس نے جھیل کے کنارے سے ابھرتے ہوئے دیکھا۔

وہ جاگ گئی تھی...... نیند سے بیدار ہو چکی تھی......

غفلت خوبی نہیں، اور جاہلیت نیکی نہیں۔ یقین کے سمندر ٹھاٹھیں مار رہے ہوں تو، بے یقینی کی دلدل میں گرنا ضروری نہیں۔ ہر چیز، ہر کیفیت نے اپنے معنی بدل دیے تھے۔ وہ پھول جو شیلے نے دیے تھے، وہ پھول جو فرشتے کے ہاتھ میں رہے تھے، وہ اس نے بہت محبت سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیے تھے۔ زندگی کسی بیماری، معذوری، تکلیف، مصیبت، پریشانی، روگ پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ تب ہی تو یہ شروع ہوتی ہے۔ انسان کو کوئی چیز مٹی سے سونا ہونے سے ہیرا، اور ہیرے سے کوہ نور نہیں بناتی جتنی جلدی تکلیف بناتی ہے۔

''اگر کوئی بیماری لعنت رہی ہے تو کیا کبھی کوئی بیماری نعمت بھی رہی ہے؟؟'' وہ فرشتے سے پوچھ رہی تھی۔

''بیماری ہر حال میں نعمت ہوتی ہے۔ ہر کیفیت اور ہر احساس میں۔ وہ کتنی ہی معمولی، بے ضرر اور مختصر دورانیے کی کیوں نہ ہو۔ تکلیف ہر حال میں نفع ہے۔ گناہگار کو ہو تو بھی، مومن کو ہو تو بھی، یہ ہر حال میں اللہ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔ خدا کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب ''بیمار'' رہتا ہے...... وہ جسمانی بیمار ہو، ذہنی، روحانی، جذباتی یا دلی...... وہ خدا کی محبت اور توجہ کا سب سے زیادہ مستحق قرار

Sumaira Hameed:Author

پاتا ہے.....بیمار.....یہ اللہ کی رحمتوں کے سایے میں رہتا ہے.....بیماری یہ لعنت نہیں، رحمت ہے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

مادی چیزیں ہاتھ سے نکل جائیں تو دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن صرف ایک چیز ایسی ہے جو دوبارہ کبھی حاصل نہیں کی جا سکتی.....اور وہ ہے''زندگی''۔(اسٹیو جابز)

اس نے سفید ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنی تھی۔جینز اور کینوس شوز۔بال برش کر کے اس نے اونچی پونی بنائی تھی۔ماما اس کے ساتھ آنا چاہتی تھیں لیکن اس نے کہا کہ وہ اکیلی چلی جائے گی۔ٹیکسی سے آتے ہوئے، اس نے فلور شاپ سے بچوں کے لیے پھول بھی لیے تھے۔شیلے تو اسے نہیں ملے گی،لیکن شیلے جیسی بہت سی بچیاں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں۔

''میں ٹریمنٹ شروع کروانا چاہتی ہوں۔''بچوں سے ملنے کے بعد وہ ڈاکٹر کے پاس آئی تھی۔

ڈاکٹر خوش تھا اور حیران بھی۔''میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس چیز نے تمہارے ارادے(ہٹ دھرمی) کو اچانک سے بدل دیا؟''بندہ ڈاکٹر ہی کیوں نہ ہو فطرت سے مجبور ہو کر طنز کر ہی جاتا ہے۔وہ اس کا پرانا رویہ نہیں بھولا تھا۔

''بہت ساری ایسی چیزوں نے جن کے احساس سے تو میں واقف ہوں لیکن نام سے نہیں۔مجھے ایسی بیماری ہوئی ہے جس کی دوا اور علاج، دونوں موجود ہیں۔یہ بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔مجھے ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ہمت کرنی چاہیے۔''

ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے واہوئی تھیں۔''تم نے بہت گہری بات کہہ دی ہے۔''(کہاں سے پڑھ کر آ رہی ہو؟)

''اگر یہ زندگی مجھے اس لیے دی گئی ہے کہ میں اس بیماری سے لڑوں تو میں ضرور لڑوں گی۔اگر چوائس میرے ہاتھ میں دی گئی ہے کہ میں اس سے ہار جاؤں، یا اسے جیت جانے دوں تو میں.....تو میں چوائس میں''شکست'' لینا پسند نہیں کروں گی.....''

کل کرسی الٹ کر جانے والی لڑکی، آج کرسی پر بیٹھی ہار اور جیت کی باتیں کر رہی تھی۔ڈاکٹر کو اگلی بات کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے میں وقت لگا تھا۔''تم میں آنے والی تبدیلی حیران کن ہے حد ی!''

اس نے قہقہہ لگایا۔''تو پھر ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں تیار ہوں لیٹس فائٹ بیک(چلیں جوابی حملہ کریں)۔''اس نے ہاتھ کا مکا بنایا اور اسے ہوا میں مارا۔''مجھے کمزور مت سمجھیں.....میں چاہوں تو پہلے راؤنڈ میں ہی اسے ناک آوٹ کر سکتی ہوں۔ویسے کیا مجھے پہننے کے لیے باکسنگ گلوز دیے جائیں گے.....منہ میں فٹ کرنے کے لیے نقلی دانت، وغیرہ، وغیرہ؟''

ڈاکٹر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔''دیے تو نہیں جاتے، لیکن تمہارے لیے منگوا لیں گے۔اگر تم ان کے لیے برانڈ برانڈ کی رٹ نہ لگاؤ تو.....''ڈاکٹر بھی اسے انسٹا پر فالو کرتا رہا تھا.....یقیناً

''آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''ان کے ساتھ ٹیسٹ کے لیے آتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاں.....آہ.....''ڈاکٹر نے باقاعدہ آہ بھری تھی۔''ایک عدد موٹی سی بیوی کا شوہر ہوں میں۔میرے خوابوں میں تو چینی لو پیز آیا کرتی تھی لیکن حقیقت میں مجھے موٹی لو پیز مل گئی.....''

Sumaira Hameed:Author

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ وہ ہنستی ہی جا رہی تھی...... ڈاکٹر نے رک کر اسے دیکھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا تم ٹریٹمنٹ کے دوران بھی ایسے ہی ہنس سکتی ہو؟؟''

وہ ایک لمحے کے لیے سنجیدہ ہوئی تھی۔ ''کیا ٹریٹمنٹ کے دوران بھی آپ ایسے ہی لطیفے سنا سکتے ہیں؟ ویسے کیا آپ کی موٹی لوییز، پیسٹری کو کیز بہت کھاتی ہے؟''

''وہ میرا سر کھاتی ہے...... وہ بھی مکھن لگائے بغیر، دیکھو اسی لیے تو گنجا ہو گیا ہوں۔'' سر جھکا کر اپنے گنجا سر دکھایا بھی۔

اس کی بے ساختہ ہنسی نے بہت سے لوگوں کو اسے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہو چکی تھی۔ زندگی کے آسمان پر امید کے چراغ جلا کر رکھ دیے تھے......

''مجھے فخر تھا کہ میں آپ کی اکلوتی اولاد رہی ہوں۔ لیکن اب سوچتی ہوں کہ کاش میرا کوئی اور بہن بھائی بھی ہوتا'' ماما، پاپا دونوں اس کے ساتھ تھے۔ دونوں بہت خوش تھے، کیونکہ وہ خوش اور مطمئن تھی۔ ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے دل کا ایک خیال ان سے کہہ دیا تھا۔

''میرے دس بچے بھی ہوتے تو تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا'' ماں کو خیال آیا کہ وہ ان کے تنہا رہ جانے کے خیال پر آبدیدہ ہے۔

''کبھی کبھی ہم بہت زیادہ ماڈرن ہو کر ٹھیک نہیں کرتے ماما! آپ کو اپنی فٹنس کی فکر تھی، اس لیے مجھے اکلوتا رکھا۔ مجھے بلا شرکت غیر آپ کی محبت پر فخر تھا، اس لیے کبھی بہن بھائی کی ضد نہیں کی۔ دونوں لالچی اور مفاد پرست بنے رہے۔ ہے نا؟''

ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ اس کی بات سمجھ چکی تھیں۔ اس کے پاس ماں تھی، باپ تھا، لیکن خون کا کوئی دوسرا رشتہ موجود نہیں تھا۔ اب وہ تنہا ہوئی تھی تو اسے احساس ہوا تھا کہ بہن بھائی، یہ دوا اور شفاء کی طرح کام کرتے ہیں۔ بیمار کی آدھی بیماری اس کے خاندان کے لوگ جھیل جاتے ہیں۔

''میں آپ سے شکایت نہیں کر رہی۔ میں بس یہ کہہ رہی ہوں کہ شاید ہم نے زندگی کی حقیقی پلاننگ میں گڑبڑ کرنا شروع کر دی ہے۔''

''پلاننگ؟'' انہوں نے گہری سانس بھری۔ ''انسان اور اس کے پلانز...... کیا ہیں؟ سب دھواں......'' وہ اداس ہو گئیں۔

''ماما سنیں! ایک دم سے ہی مجھے بچے بہت اچھے لگنے لگے ہیں۔ میرا دل ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ میں انہیں بیمار یا تکلیف میں دیکھتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ ایسا پہلے تو نہیں تھا۔ شاید شیلے نے مجھے بدل دیا ہے۔''

ماما نے اس کی پیشانی چومی۔ ''تمہارا دل معصومیت اور محبت کی طرف کھنچ رہا ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔''

''ہاں...... شاید......''

اس نے کال کر کے ہیئر اسٹائلر کو ہاسپٹل ہی بلوا لیا تھا۔ وہ اپنا سر صاف کروا رہی تھی۔ وہ بال عطیہ کر رہی تھی۔ ہیئر اسٹائلر سر وغیرہ سیٹ کر رہی تھی کہ وہ واش روم میں آ گئی تھی۔ وہ ایک بار خود کو ''مکمل'' دیکھنا چاہتی تھی۔ جتنی خوب صورت وہ خود تھی، اتنے ہی خوب صورت

Sumaira Hameed:Author

اس کے بال تھے۔وہ ان پر سالانہ لاکھوں ڈالر خرچ کرتی تھی۔ایڈوانس ٹریٹمنٹ لیتی تھی۔پاپا کی طرف کی مشرقیت نے اس میں لمبے بالوں کا شوق بیدار رکھا تھا۔اس نے جب کبھی انہیں اسٹائل دیا تھا، یہی کوشش کی تھی کہ ان کی لمبائی کم نہ ہو۔وہ حقیقی معنوں میں ان لڑکیوں میں سے تھی جو ''گردن کٹے لیکن بال نہ کٹیں۔'' کے زمرے میں آتی تھی۔عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی۔وہ ماڈرن ہو یا سادہ طبیعت...... اس کی حسن کی تکمیل بالوں سے ہوتی ہے۔وہ خود سے اتنا پیار نہیں کرتی جتنا اپنے بالوں سے کرتی ہے۔

اور اب......

اس نے ہتھیلی سے اپنی نم آنکھیں سختی سے رگڑیں۔کیا ہر چیز کو ختم ہونے میں بس ایک لمحہ ہی لگتا ہے؟ بس؟

ہر چیز فانی ہے...... ہر چیز ختم ہو جانے والی ہے......

منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ باہر نکلی۔چیئر سیٹ ہو چکی تھی۔سامنے گول مرر رکھا تھا۔وہ بیٹھی تو اس کے گرد سفید ایپرن لپیٹ دیا گیا۔اسٹائلر نے اس کے بالوں کو سمیٹ کر اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی میں مقید کیا تو اس نے ایسی گہری آہ بھری کہ کائنات کی ہر شے ایک لمحے کے لیے اداس ہو گئی......

جب آپ زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں سے پریشان ہو کر بد دل ہو جائیں تو اس وقت بس اتنا سوچ لیں کہ دنیا میں کہیں کوئی اپنی ''زندگی'' کے لیے ہی پریشان ہو رہا ہے۔ہو سکتا ہے آپ چھوٹے بڑے مسائل کی جنگ لڑ رہے ہوں، لیکن وہ تو زندگی کی ہی جنگ لڑ رہا ہے۔اس جنگ میں وہ ایک ایک کر کے اپنی سب قیمتی، پیاری، دلاری چیزوں سے ہاتھ دھوتا جا رہا ہے۔جب آپ اس لیے پریشان ہوں کہ آپ بھدے ہیں، موٹے یا ناٹے ہیں۔آپ انٹری ٹیسٹ میں کامیاب نہیں ہو سکے، اچھی جاب نہیں حاصل کر سکے۔اچھے کپڑوں، جوتوں اور لگژریز سے محروم ہیں۔غربت کی چکی میں پیستے پیستے تھک کر چور ہو چکے ہیں، اس وقت اس شخص کے بارے میں ضرور سوچیے گا جو اپنی سب سے قیمتی شے ''زندگی'' سے ہی ہاتھ دھونے جا رہا ہے......

''دیکھیں کہ نیلگوں آسمان کیسا پیارا ہے اور گھاس کیسی سرسبز ہے۔یہ سب کتنا خوب صورت ہے۔سوچیں کہ آپ کس قدر خوش قسمت ہیں کہ سانس لے رہے ہیں۔شکر گزار ہوں کہ آپ معمولی یا حل طلب مسائل کا شکار ہیں۔ہو سکتا ہے کہ آپ کا دن مشکل رہا ہو۔آپ کی نیند اچھی نہ رہی ہو، آپ کا ہیئر کٹ خراب ہو چکا ہو، آپ موٹی ہوں اور آپ کا پیٹ نکلا ہوا ہو۔ان فضولیات میں نہ پڑیں۔میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ ان چیزوں کے بارے میں آپ تب نہیں سوچیں گے جب نوبت ''زندگی'' پر آ جائے گی۔میں نے دیکھا ہے کہ لوگ کام کی زیادتی پر شکایتیں کرتے ہیں......شکر گزار ہوں کہ آپ کا جسم اس قابل ہے کہ آپ کام کر سکتے ہیں۔اپنی تندرستی کی قدر کریں۔زندگی جسمانی خوبصورتی سے کہیں آگے کی چیز ہے......یہ روحانی بیداری کا نام ہے......اس پر بھی توجہ دیں...... ہر اس پل میں شکر گزار ہوں جو تکلیف سے مبرا گزر رہا ہے۔حتیٰ کہ ان دنوں میں بھی جب آپ فلو، بخار یا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں جو جان لیوا نہیں ہے......شکر گزار ہوں......شکر گزار ہوں......اور بس شکر گزار ہوں......'' (ہولی بوچر کے خط سے)

☆ ...... ☆ ...... ☆

Sumaira Hameed:Author

''الحمد اللہ ...... میں کینسر کی جنگ جیتنے کے لیے تیار ہوں ......''

جس دن وہ ہاسپٹل ایڈمٹ ہوئی تھی اسی دن اس نے اپنی بیماری کی خبر کو آفیشل کر دیا تھا۔

خبر پھر سے جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ جولڑکی پیرس فیشن ویک کو کور کرتی رہی تھی، وہ لڑکی اب ہاسپٹل کے بیڈ پر ہو گی۔ اس تصور نے کچھ لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور کچھ کو ...... ظاہر ہے ...... سکون نصیب ہوا تھا۔ اس کی شہرت نے لاتعداد لوگوں کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہی دشمن اب وقت کے بدلنے پر خوش تھے۔ اس کے گرد کسے بیماری کے شکنجے سے ناداں نہیں تھے۔

نیوز چینل، پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا کے کرتا دھرتا، اس سے ملنا چاہتے تھے۔ انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ اسے لائیو لے جانا چاہتے تھے۔ کوور پر لانا چاہتے تھے۔ کینسر کے لیے کام کرنے والے ادارے اور این جی اوز اسے کچھ تعمیری مقاصد کے لیے ایکٹیو کرنا چاہتی تھیں۔ والاگرز اس کے ہاسپٹل آنا چاہتے تھے، اس کی ٹریٹمنٹ کو ریکارڈ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ اس کی بیماری کو ریئلٹی شو بنانا چاہتے تھے۔ وہ چوبیس گھنٹے کیمرے کو اس کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اب ہر چیز بکنے لگی تھی۔ اب ہر چیز کی قیمت لگنے لگی تھی۔ ''کینسر'' کی بھی۔ چند این جی اوز کے علاوہ، باقی سب صرف اپنے بزنس اور فائدے کے لیے آفرز کر رہے تھے۔ وہ اس بدلتی دنیا کے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں جو پتھر کوڑھیوں کو پڑا کرتے تھے، زمانہ جدید میں بھی ویسے ہی کچھ پتھر موجود تھے۔

''آپ اپنے احساسات، کیفیت، تکلیف، اور جو کچھ بھی آپ محسوس کرتی ہیں وہ ہمارے لیے لکھ سکتی ہیں؟'' این جی او کا نمائندہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''کس لیے ......؟ کوئی اپنی بیماری یا تکلیف کو یادگار کیوں بنائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ میں سوشل میڈیا پر بہت ایکٹیو رہی ہوں لیکن اب میری دلچسپی ان سب چیزوں میں صفر ہو چکی ہے۔ میں زندگی کا ایک ایک لمحہ جینا چاہتی ہوں، تصویریں کھینچ کھینچ کر پوسٹ کرنے میں ویسٹ نہیں کرنا چاہتی۔''

''آپ سمجھیں نہیں مس حدی! ہماری این جی او نان پرافٹ ادارہ ہے۔ ہمیں شہرت چاہیے، نہ بزنس۔ دنیا میں لاتعداد لوگ اس بیماری سے لڑ رہے ہیں۔ اس بیماری کے لیے دوا، اور دعا سے زیادہ جس چیز کی سب زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ ہے ''امید''۔ ایسی امید جو یہ یقین دلائے کہ بیماری بڑی نہیں ہوتی، انسان کی ہمت اور طاقت بڑی ہوتی ہے۔ امید اس بہادری کا نام ہے، جو کینسر کو معمولی اور ''کوشش'' کو غیر معمولی بناتی ہے۔ ہمیں یہ بہادری انہیں دینی ہے۔''

''میرے کیس میں تو امید نہ ہونے کے برابر ہے......'' وہ تلخی سے ہنسی۔

''ہر کیس میں امید ہوتی ہے اور یقین بھی۔ ہم اتنی زیادہ سائنس کی زبانیں سیکھ چکے ہیں، کہ معجزوں کی زبان بھول چکے ہیں۔''

وہ چونکی تھی۔ ''تو آپ معجزوں پر یقین رکھتے ہیں؟''

''آپ ٹریٹمنٹ نہیں کروانا چاہتی تھیں، اب کروا رہی ہیں، کیا یہ معجزہ نہیں؟ کیا آپ خدائی اشارے یا خدائی پیغام پر علاج پر رضا مند نہیں ہوئیں؟''

Sumaira Hameed:Author

وہ حیران پریشان این جی او کے نمائندے کی شکل دیکھ رہی تھی...... ایسا ہی ہوا تھا......

''کیا ہماری اس دنیا کا ہر منظر خدا کی نشانیوں اور پیغاموں سے بھرا ہوا نہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' اس نے اقرار کیا۔ اس کے سامنے فرشتہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ فرشتے موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اس کی بھلائی کے پیغام تھے۔ وہ اسے فلاح کی طرف پیش قدمی پر اکساتے تھے۔ وہ اسے اُمید کے جام بھر بھر کر پلاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر کیا نشانی ہو سکتی تھی۔

''ہولی بوچر، ستائیس سالہ آسٹریلین لڑکی ہے۔ اس کے ایک خط نے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ اس کے لفظوں نے زندگی کے مشکل کلیے، آسانی سے سمجھا دیے ہیں۔ اس کے خط کا اثر سب سے زیادہ نوجوانوں نے لیا ہے۔ وہ مادی زندگی سے نکل کر حقیقی زندگی کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ مردہ دلوں کو 'زندگی' کی موجودگی کا احساس دلا دینا، یہ بھی زندگی دینے کے برابر ہوتا ہے۔''

''اگر میں مر گئی تو...... لوگ نا امید ہو جائیں گے......'' وہ خوفزدہ تھی۔

''زندگی کے ساتھ کبھی 'اگر' نہیں لگتا۔ پیدا ہونے والا کبھی یہ نہیں کہہ سکتا 'اگر میں پیدا ہو گیا۔ اگر مجھے زندگی عطا کر دی گئی۔' زندگی پہلا معجزہ ہے جو انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے کوئی قیمت نہیں چکانی پڑتی۔ زندگی موجود رہتی ہے، وہ آگے شفٹ ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ چیز زیادہ اپ سیٹ نہیں کرتی کہ ہم مر جائیں گے، ہم تو اس لیے پریشان ہوتے ہیں کہ ہم دنیا چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ ہم اسی دنیا کو آخری یقین سمجھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آخری منزل اور سب سے بہترین جگہ۔ دکھائی دینے والی چیزیں حقیقت لگتی ہیں، اس لیے ہمیں نہ دکھائی دینے والی دنیا 'غیر حقیقی' لگتی ہے یا مشکوک لگتی ہے۔ اور اسی لیے ان دیکھی دنیا، ان دیکھے معجزے، ان دیکھا یقین، یہ سب ہمیں حقیقت نہیں لگتے۔ ویسے بھی انسان شک کرنے میں جلدی، اور یقین کرنے میں ذرا دیر کر دیتا ہے۔''

''کیا آپ سمجھ گئیں؟'' وہ بے چارا کافی دیر سے بول رہا تھا۔

''کچھ کچھ......'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کچھ دیر پہلے کی باتوں میں، میں صرف یہ بات ایڈ کرنا چاہوں گا کہ ہمیں صرف زندگی کی بات کرنی ہے۔ جو اتنی طاقت ور ہے کہ یہ کائنات کی ہر شے کو متوجہ کر لیتی ہے۔''

حدی دلچسپی سے سن رہی تھی کہ کیا وہ بھی آسمان سے بھیجا گیا کوئی فرشتہ تھا۔ یا اب ہر انسان فرشتوں کی زبان میں بات کرے گا۔ ہر شے خدائی اشارہ ہو گی۔ ہر پھول امید بھری خوشبو دے گا۔ ہر کرن یقین بنے گی۔ کیا کائنات کی ہر شے ایسے ہی کام کرتی ہے؟ کس لیے؟ صرف اس لیے کہ وہ انسان ہے؟ کیوں؟ کیونکہ وہ کائنات میں سب سے زیادہ اہم ہے؟ ایسے کیسے؟ اس لیے کہ دنیا میں کوئی شے ''انسان'' سے زیادہ قیمتی نہیں۔ انسان ایسا ہی خاص الخاص ہے...... تو وہ عام کیوں بنتا ہے......

''موت امید کے دروازے بند نہیں کر سکتی مس حدی! ہمیں لوگوں کو یہی تو سکھانا ہے کہ زندگی لمبی مدت کا نہیں، ہر لمحے میں زندگی جینے کا نام ہے۔ کوئی بیماری لاعلاج نہیں ہوتیں۔ ہر درد کی دوا ہے، ہر دوا میں شفا ہے، اور یہ شفا انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔ اسے

Sumaira Hameed:Author

اس شفا کو ڈھونڈ نکالنا ہے۔ بیماری انسان کو تنہا کر دیتی ہے ،ہمیں اسے اس تنہائی سے نکالنا ہے، اسے واپس زندگی کا حصہ بنانا ہے۔''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

کیا آپ ہمارے لیے لکھیں گی؟؟ وہ پوچھ رہا تھا۔

وہ یک ٹک اس کی پشت کے پیچھے کھڑے اپنے فرشتے کو دیکھ رہی تھی......

''اس دنیا کو اس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ''امید'' ہے......''فرشتہ کہہ رہا تھا۔

''ہوا، پانی، خوارک، سانس سے بھی زیادہ۔ بے یقینی کی اس دنیا کو مایوسی کے گرداب سے نکلنے کی سخت ضرورت ہے۔ ڈپریشن، مایوسی، نا تمام خواہشیں، بے قراریاں، تکلیفیں، غم، بیماریاں، سب......امید کے ضرورت مند ہیں۔ دنیا بھر کے، منکروں، قلمکاروں، اسکالرز کو چاہیے کہ وہ اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ صرف امید بانٹنے میں لگ جائیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ صرف امید بھری لوریاں گائیں۔ اس وقت بھی جب ان کے بچے گود سے نکل کر اپنے بچوں کو گود میں کھیلانے لگیں۔ لکھنے والے صرف امید لکھیں، گانے والے صرف اسے گائیں۔ دنیا کے ہر رنگ کو امید کے رنگ میں لپیٹ دیا جانا چاہیے۔ اس دنیا کو، اس دنیا کے ہر انسان کو، اس وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے......وہ صرف ''امید'' ہے۔''

''ٹھیک ہے......میں لکھوں گی......''وہ کہہ رہی تھی۔

فرشتے کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں......وہ واقعی میں مسکرا رہا تھا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

مس فائزتین مہینے سے ہاسپٹل میں تھیں۔ اس دوران وہ تین بار چھٹی کی درخواست کر چکی تھی۔ اور تینوں بار ڈاکٹرز نے اسے بہلا دیا تھا۔ ان کے پاس بہانوں کی کمی نہیں تھی، اس کے درخواستوں کی۔ چوتھی بار اس نے درخواست نہیں، التجا کی تھی کہ اسے چوبیس گھنٹے کے لیے ہاسپٹل سے باہر جانے دیا جائے۔

اس کی التجا کو مان لیا گیا تھا۔ اور اب وہ، خوشی، آزادی، بے فکری، روشنی، آسمان، گھاس، پھولوں پودوں، فرینڈز، کلاس فیلوز، پروفیسرز وغیرہ سے ملنے جا رہی تھی۔ ماما نے اسے وگ لا دی تھی لیکن اسے پہن کر وہ اتنی دیر تک ہنستی رہی تھی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں

''اف ماما! میں کتنی بے وقوف رہی ہوں ناں۔ آج وگ کو سر پر رکھا تو اندازہ ہوا کہ ہمارے قدرتی بال ہمیں وزنی نہیں لگتے۔ ہم کبھی بھی سر پر ان کا بوجھ محسوس نہیں کرتے۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے، اور یہ بات مجھے آج معلوم ہوئی ہے۔''

اس نے وگ نہیں پہنی تھی۔ اسٹالر سے سر کو کور کر لیا تھا۔ اس کی آنکھیں تک مسکرا رہی تھی۔ اس کی پوری ہستی گواہ تھی کہ آج وہ صحیح معنوں میں مسکرا رہی ہے۔ اس نے آج جانا تھا کہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ زندگی بے کار کے کاموں اور باتوں میں وقت اور انرجی برباد کرنے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو لمحہ بہ لمحہ پھلنے پھولنے، روحانی منزل طے کرتے، اخلاقی مضبوطی حاصل کرنے کا نام ہے۔

لوز ڈینیم کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، جوگرز کے بل پر دو قدم چلتے، تین قدم اچھلتے، چار قدم جھولتے، پانچ قدم پھڑ پھڑاتے، کودتے

Sumaira Hameed:Author

پھاندتے وہ ''چل'' رہی تھی۔ ہر ڈریس کی ایک کوڈ چال ہوتی ہے، آج کی چال کا کوڈ ''خوشی'' تھا۔ آزادی اور بے فکری تھا۔ وہ بس سے یونیورسٹی آئی تھی۔ یہیں اس نے اپنی فرینڈز کو بلا لیا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز میں سے زیادہ تر یونیورسٹی میں ایڈوانس اسٹڈی کر رہے تھے۔ انہیں ان سب سے ملنا تھا، چونکہ چھٹی ایک ہی ملی تھی، اس لیے وہ زیادہ شوخی نہیں ہو سکتی تھی۔

اسٹاپ پر اتر کر وہ یونیورسٹی تک پیدل چل رہی تھی۔ رک کر اس نے اپنے لیے آئسکریم لی تھی۔ شاپس کی ونڈو اسکرین میں اس نے اپنا عکس دیکھا تھا۔ سیٹ کرنے کے لیے بال نہیں تھے۔ کراس بیگ میں ہاتھ ڈال کر اس نے لپ گلوز نکالا اور اسے ہونٹوں پر لگانے لگی۔ دوبارہ ہاتھ ڈالا تو گلاسز بھی مل گئے۔ ماما نے رکھے ہوں گے۔ اس نے آنکھوں پر لگا لیے۔ گردن کو ادھر ادھر کر کے خود کو دیکھا۔ شاپ کی بوڑھی مالکن باہر نکلی اور گملے میں لگے تازہ پھولوں میں سے ایک پھول توڑ کر اسے دیا......

''گیٹ ویل سون......ایسے ہی مسکراتی رہو۔'' شانے تھپک کر کہا۔

پر پل پھول......عورت کی مسکراہٹ اور شانے پر تھپکی......تینوں چیزوں نے اسے مالا مال کر دیا تھا۔ پھول اس نے ناک کے قریب کر لیا تھا۔ کتنی پاگل تھی وہ، اب جانا تھا کہ زندگی کی خوشبو، ماں کی خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔ اور ان دونوں کی خوشبو کائنات کے کونے کونے سے آتی ہے۔

لائم وغیرہ سب یونیورسٹی کے لان میں گھاس پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان تک آتے آتے، اسے کتنی بار رکنا پڑا تھا۔ ہائے ہیلو کرنے، حال چال پوچھنے والوں کے پاس رکنا پڑا تھا۔ وہ اس حدی سے نہیں مل رہے تھے جو بہت امیر، فیشن ایبل اور مشہور تھی، وہ اس حدی سے مل رہے تھے جو بیمار تھی۔ اور جسے اچھے الفاظ اور بے شمار مسکراہٹوں کی ضرورت تھی۔

''تمہیں ایسے گھٹیا کپڑے پہن کر یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا۔'' لائم نے اس کے عجیب وغریب حلیے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھنے والے کیا کہیں گے، حدی اتنی غریب ہو گئی ہے کہ گھسی پٹی جینز کو پہننے پر مجبور ہو گئی ہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ آتے ہی کمر کے بل گھاس پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے، اب ہی تو میں امیر ہوئی ہوں۔ آج میرے پاس پورے چوبیس گھنٹے ہیں......پورے چوبیس گھنٹے......سب ڈاکٹرز کو میں بھاڑ میں جھونک آئی ہوں۔ دوائیاں لاکڈ کر آئی ہوں۔ نرسز کو آنکھ مار کر، ہاسپٹل کو ٹاٹا، بائے بائے کہہ آئی ہوں۔ دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ باقی بچے پورے بائیس گھنٹے......کیسا؟'' وہ ہاتھ اٹھا کر سوالیہ پوچھ کر داد لینا چاہ رہی تھی۔

''لگتا ہے تم نے ''ان ٹائم'' موووی دیکھ لی ہے۔ جہاں جس کے پاس جتنا وقت ہوتا ہے، وہ اتنا ہی امیر ہوتا ہے۔''

''فی الحال تو تم سب مجھ سے زیادہ امیر ہو۔'' گھاس پر وہ بچوں کی طرح مچل رہی تھی۔

''تم ان تین مہینوں میں کرتی کیا رہی ہو۔ میں تو انسٹا، فیس بک پر تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔'' اس کا کلاس فیلو پوچھ رہا تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''کنجوسوں کافی ہی پوچھ لو......اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہوں۔'' سفر سے اس کا مطلب تین مہینوں کا سفر تھا۔ کسی کا بیگ گھسیٹ کر اس نے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ ''بڑی پیاری ہوتی ہے یہ گھاس واس یار!'' گھاس پر ہاتھ پھیرے خود سے کہا

Sumaira Hameed:Author

''کنجوس نہ کہو، غریب کہو......''لائم نے بیگ میں سے گھٹیا سی چاکلیٹ نکال کر اس کی طرف اچھالی جو لیٹے لیٹے اس نے کیچ کر لی۔

''جی چاہتا ہے کہ ایسی ہی ایک بڑی سی یونیورسٹی بنواؤں اور اس پر حدیٰ نام لکھ کر دنیا والوں کو گفٹ کر دوں۔''اس نے یونیورسٹی کی عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور اطراف نظر دوڑا رہی تھی۔

''تم ہم غریبوں کو ایک ایک گھر گفٹ کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟ یقین جانو میں اپنے بیوی بچوں کی پیشانیوں تک پر تمہارا نام کھدوا دوں گا......یہ بڑے بڑے حروف میں......حدیٰ......''

لائم کی بات پر بے ساختہ قہقہہ پڑا تھا۔

''بڑے بے غیرت ہو......''اس نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں......بہت بڑا والا بے غیرت ہوں......اب تو گھر ملے گا نا؟''

وہ ہنسنے لگی۔''چلو یونیورسٹی دیکھتے ہیں۔پروفیسرز سے ملتے ہیں۔آج مجھے لائبریری بھی دیکھنی ہے۔''وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں لائبریری کو شرمندہ کرنا ہے؟؟''وہ سب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔وہ انہیں لیڈ کر رہی تھی۔

''نہیں......خود کو......میں بھی اپنی ایک بک لکھ رہی ہوں......''اس نے فخر سے بتایا تھا۔

''واہ کیا قسمت ہے تمہاری۔یعنی کتابیں پڑھ پڑھ کر بور جیسے ہم ہو گئے، اور بک لکھنے کی نوبت تم پر آ گئی۔مجھے تو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔''

''اپنے گولڈ میڈلز کا پھندا بنا کر جھول مرو۔ان تین مہینوں میں، میں نے چھ بکس پڑھی ہیں۔''چلتے چلتے وہ ایڑی کے بل گھوم کر بتانے لگی تھی۔یہ اتنی بڑا......اتنا بڑا والا کارنامہ تھا کہ اس کا ماننا تھا کہ اسے ٹرافی دی جانی چاہیے......

''پوری''چھ''۔یعنی اتنا پڑھ لیا تم نے؟ کیوں اپنے دماغ بے چارے پر اتنا بوجھ ڈالا ڈیئر! جس کام کا وہ عادی نہیں ہے، وہ کام اس سے زبردستی کیوں کروایا؟ کیسے کیسے نہیں تڑپا ہو گا وہ معصوم۔کہتا ہو گا اچھا بھلا فیشن میں کھپ رہا تھا، یہ کہاں لگا دیا مجھے۔''

''شٹ اپ! تم ہمیشہ مجھ سے جیلس رہے ہو۔''

''اب میں تم سے حد درجہ متاثر ہو رہا ہوں۔''لائم نے سنجیدگی سے کہا۔''تم حیران کن ہو۔بلکہ بہت خاص ہو۔''وہ واقعی میں بہت حیران تھا۔وہاں موجود ہر شخص حیران تھا......وہ، وہ حدیٰ نہیں تھی، جسے وہ جانتے تھے۔اتنے سے وقت میں، وہ ان سے زیادہ بیدار لگنے لگی تھی۔اس کی چال، اس کا انداز، دنیا کو دیکھنے والی اس کی نظر، سب میں انقلاب برپا ہو چکا تھا۔

اس کے چہرے پر معصومانہ خوشی تھی۔جس یونیورسٹی میں وہ پورے چار سال تک پڑھتی رہی تھی، اس یونیورسٹی کو وہ آج ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یہاں پہلی بار آئی تھی۔یونیورسٹی کی چہل پہل نے اس کا دل ہشاش بشاش کر دیا تھا۔زندگی اور دنیا کی رونق انسان کے دم قدم سے ہے۔آوازسے، پکار سے، شور سے، قہقہوں، کچھ فکر، زیادہ بے فکری، اور جوش و خروش سے۔

وہ اپنی کلاس کی طرف جا رہی تھی کہ اسے کوریڈور میں اپنے جیسی لڑکیاں نظر آئیں۔ایک کے سر پر کیپ تھی، دوسری کا بکھیر بالوں کا

Sumaira Hameed:Author

سرنمایاں تھا۔ وہ پہلے کبھی یہ جان ہی نہیں پائی تھی کہ زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی چلتی ہے۔ تندرستی کے ساتھ ساتھ بیماری۔ پھر اپنی بیماری پر اس نے ایک دم سے زندگی کو روک کیوں لیا تھا؟ جو روح پیدا کر دی گئی ہے، اس پر کبھی ''فل اسٹاپ'' نہیں لگتا۔ یہ جہاں، یا وہ جہاں، سفر جاری رہتا ہے...... جاری رہتا ہے......

کیسی بھی مشکلیں آئیں، تکلیفیں ملیں، رنج و غم کے جوار بھاٹا پھوٹیں، اس جہاں میں، اس زندگی پر کبھی ''فل اسٹاپ'' نہ لگانے دیں...... چلتے رہیں...... سفر جاری رکھیں...... بس چلتے رہیں......

پروفیسرز سے ملنے کے بعد ان سب نے لنچ کیا تھا۔ شام کو وہ ایک چھوٹا سا تھیٹر شو دیکھنے کے لیے چلے گئے تھے۔ ان کا دس لوگوں کا گروپ بسوں میں سفر کر رہا تھا۔ انہیں لنچ کہاں کرنا ہے، کافی کہاں پینی ہے، کون سا شو دیکھنا ہے، کس پارک کو برباد کرنا ہے۔ وہ بحث کر رہے تھے، جھگڑ رہے تھے، چلا رہے تھے، ایک دوسرے کو طعنے دے رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ کبھی بس میں بیٹھے، کبھی فٹ پاتھ پر کھڑے، کبھی ریسٹورنٹ میں میزوں کے گرد کرسیاں کھینچتے، وہ سب حدی اور رحدی کی کچھ پرانی لیکن مضحکہ خیز تصویروں کو تشدد کا نشانہ بھی بنا رہے تھے۔ وہ امامہ، اس کی کچھ ایسی حرکتیں یاد دلا رہے تھے، جو یونیورسٹی میں وائرل رہی تھیں۔ وہ چال بدل کر، اس کا انداز اپنا کر، اس کی نقلیں اتار رہے تھے۔ ہنس ہنس کر اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔

''ایک بار تم ایسا ڈریس پہن کر یونیورسٹی آئی تھی کہ میں چپکے سے تمہاری تصویر لیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔''

''اتنی اچھی لگ رہی تھی میں؟'' اپنی تعریف سن کر اسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

''اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ سوچا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں تو میں نے وہ تصویر ادھر ادھر بانٹ دی۔''

''تم سب بہت کمینے رہے ہو......'' اس نے منہ بنا لیا تھا۔ وہ سب کافی پی رہے تھے۔ اور دل پر بھاری پتھر رکھ کر انہوں نے کچھ مہنگی والی پیسٹریاں منگوائی تھیں۔ حدی آج بھی انہیں مہنگی ہی پڑنے والی تھی...... اف یہ مہنگائی...... اف یہ ان کی غربت......

''کسی جوکر سے کم تم بھی نہیں رہیں...... گردن میں سریا، آنکھوں میں سیسہ۔ چال میڈونا، انداز کیٹی پیری۔ پتا نہیں تم امیر لوگ ایسی واہیات چیزیں کہاں سے سیکھ لیتے ہو۔ دنیا کو جوتی کی نوک پر رکھنا اور انسان کو، انسان نہ سمجھنا۔ دولت تو بڑی لعنت ہے۔''

''ہاں! ایسا ہی ہے۔'' حدی نے امامہ سے اتفاق کیا تھا۔ وہ ایسی ہی رہی تھی، لیکن وہ اکیلی تو ایسی نہیں تھی۔ آدھی دنیا اس جیسی تھی۔ شو آف اور واہیات۔ مغرور اور بد دماغ۔ جیب میں ساری دنیا کی اتھارٹی رکھ کر پوزیشن اور اسٹیٹس کی دوڑ میں دوڑنے والے گدھے۔

اس کی فرینڈز نے کہا کہ وہ اسے ڈراپ کر دیں گی لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ شام چھ بجے تک وہ ان سب کے ساتھ رہی پھر وہ ان سے الگ ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہی روٹ پر، بار بار بسیں بدل رہی تھی۔ چڑھتی تھی، اترتی تھی، چلتی تھی، اگلی بس میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہ دنیا کے بہت سارے مناظر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لینا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ واپس جائے تو اس کے پاس یاد کرنے کے لیے بہت کچھ ہو۔

رات ہو گئی تو اس نے ایک جگہ سے ڈنر کیا، دوسری جگہ سے کافی پی، تیسری جگہ سے جوس اور چوتھی جگہ بیٹھ کر وہ یہ سوچتی رہی کہ

Sumaira Hameed:Author

یہاں سے کیا کھائے۔ ویٹر کی گھوڑیاں کھانے کے بعد وہ پانی پی کر اٹھ گئی۔ راہ چلتے راہ گیر، بسوں میں بیٹھے مسافر، ریسٹورنٹس کے ویٹرز، کونے کی میز پر بیٹھی سرخ بالوں والی آنٹی، ونڈو شاپنگ کرتی مایوس صورت لڑکی، فون پر گرل فرینڈ سے بک جھک کرتا لڑکا۔ اس نے ہر منظر، ہر انسان، ہر احساس کو دل کی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگا تھا۔

ابھی رات کے نو بجے تھے۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ چلتے چلتے اسے مسجد دکھائی دی۔ پھر اس کی نظر چرچ پر پڑی۔ مسجد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چرچ کا بھی۔ وہ چونکی تھی۔ یہ بات آج اس کے علم میں آئی تھی کہ عبادت گاہوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس نے مسجد کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ مسجد کو اندر سے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اللہ کہاں رہتا ہے۔

''اپنے بندے کے دل میں۔'' فرشتے نے کہا تھا۔

''وہ کیسے ملتا ہے......؟؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''یقین سے......'' فرشتے نے اس سوال کا بھی جواب دیا تھا۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ مسجد کو اندر سے دیکھنے کی نیت سے آئی تھی...... بس...... لیکن وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ ایک دم سے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ یہ اچانک ہی ہوا تھا کہ صبح سے اب تک وہ ہشاش بشاش رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے مسجد کے اندر قدم رکھا تھا، اس کی ساری تنہائی اور پوری تکلیف، اس پر آشکار ہو گئی تھی۔ اس کا دل پگھلنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ پیشانی کے بل گر جائے...... رو دے...... خود کو کھو دے......

''کہو اللہ......'' فرشتے نے کہا تھا۔

وہ چونک گئی۔ چلتے چلتے رک گئی۔ ''اللہ......'' اسے یہ نام اجنبی لگا تھا۔ کیونکہ اس نام سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نام کو پکارنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ نام سے جان کر بھی نہیں جانتی تھی کہ ''اللہ'' کون ہے۔ نام سن کر، کہہ کر بھی، وہ اس نام سے اجنبی رہی تھی۔ مانے بغیر یا جانے بغیر ''اللہ'' پکارنا ایسے ہی ہے جیسے کسی سبق کا رٹا لگانا۔ ٹھیک ہے، اللہ رٹے پر بھی نمبر دے دیتا ہے، لیکن جس نے تیاری کی ہو، جان لگا دی ہو، دل لٹا دیا ہو...... اس کی تو کیا ہی بات ہے......

''اتنی بار کہو کہ تمہیں اس کے سوا سب لفظ بھول جائیں۔ سارا جہاں بھول جائے، یاد رہے تو بس یہ لفظ ''اللہ''۔ خدا رحمان ہے اور یہ لفظ شفاء...... دل کا دکھی، جان کا روگی، نفس سے عاجز، درد سے بلبلاتا، کسی بھی بیماری سے بیمار، کوئی بھی، کیسا بھی، صرف اس ایک لفظ کا ورد کرتا رہے تو شفا پائے گا......

شفاء کے نام پر وہ کانپ اٹھی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر ہانپنے لگی تھی۔ اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ سارا جہاں دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو ستون سے سر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے پایا۔ آنکھوں کو بے تحاشا بھیگتے اور دل و جان کو صرف ایک نام کا ورد کرتے۔

اللہ......

Sumaira Hameed:Author

وہ اپنا نام تک بھول گئی تھی...... اس نے ایک لمحے کے لیے بھی خود کو، خود میں نہیں پایا تھا۔

وہ سب سنتا ہے، لیکن اسے خاص طور پر سنتا ہے، جو صرف اسے پکارتا ہے۔ وہ سب کے پاس ہے لیکن اس کے پاس خاص طور پر ہے جو اس کی تلاش میں ہے۔ وہ سب کو دے رہا ہے، لیکن اسے خاص دے رہا ہے جو پورے یقین سے مانگ رہا ہے۔ سب بیمار ہیں، اور سب پریشان حال ہیں، اس کا رحم سب کی تلاش میں ہے، لیکن یہ رحم اس پر خاص طور پر سایہ فگن ہے، جو پرامید ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ اس کا رب اس سے غافل نہیں ہے...... یقین...... صرف یقین...... اللہ کو اپنے بندے سے صرف یہ ''یقین'' چاہیے......''

آنسو آہستہ آہستہ اس کے گالوں پر پھسلنے لگے تھے۔ ٹریٹمنٹ کے تین مہینے اس نے ہر طرح کے صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ دن کی روشنی کو اس نے اپنے آنسو نہیں دکھائے تھے۔ اب تک وہ ہمت باندھ کر بیٹھی رہی تھی، آج ہمت کی ساری پوٹلیاں اس نے یہاں کھول دی تھیں...... وہ سسکنے لگی تھی۔

''میں بہت تکلیف میں ہوں......'' پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہہ دیا تھا۔

رب اور بندے کا رشتہ...... یہ ازل سے ہے۔ اور ابد تک ہے۔ یہی باقی ہے...... باقی سب فانی ہے...... ساری دنیا اکٹھی کر کے بیٹھ جائیں، اپنے دکھ بتائیں، روئیں، چلائیں، دہائیاں دیں، اطمینان نہیں ملے گا۔ ایک آنسو اپنے رب کے سامنے بہا دے...... اللہ کا کرم، فضل، رحم، اور اطمینان...... سب ہی تو مل جائے گا۔

وہ رات بھر مسجد میں رہی تھی۔ فجر کے بعد مسجد سے نکلی تھی۔ سڑک پر دھیمی چال سے چلتے ہوئے وہ کسی ٹیکسی کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس کا سر چکرایا تھا اور خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی وہ گر گئی تھی......

ان چوبیس گھنٹوں میں وہ ڈاکٹرز کو ساتھ ساتھ اپ ڈیٹ کرتی رہی تھی۔ فون اس کے پاس تھا۔ ماما سے کچھ دیر پہلے اس کی بات ہوئی تھی۔ اس کا بی پی لو ہو رہا تھا لیکن اس نے زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ وہ سمجھی کہ زیادہ رونے کی وجہ سے ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرہ چھا رہا تھا۔ شاید نیند نہ لینے کی وجہ سے......

یہ نیند کی ہی قسم تھی...... دنیا کے ہجوم سے پرے، وہ سڑک پر ڈھیر کی طرح پڑی تھی۔

''اس کے اللہ'' کے گھر کے دروازے، اس کے پیچھے ابھی بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایسے ہی جیسے آسمان کے دروازے کھلے تھے۔ ایک طرف عبادت کے لیے جایا جاتا ہے، اور دوسری طرف حساب و انعام کے لیے ''بلایا'' جاتا ہے۔ خدا کا گھر اور خدا کا آسمان...... وہ ان دونوں کے درمیان تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ ان سب کے درمیان کھڑی تھی......

''تم جاؤ گی نہیں، ابھی نکلو گی یہاں سے۔'' اسے ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا، درخت کی شاخ سے دھکیلا گیا تھا کہ ابھی نکلو، دفع ہو جاؤ۔ والد جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے تھے۔ دبیسا نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ پھر اپنے پورے خاندان پر نظر دوڑائی۔ وہاں بچا ہی

Sumaira Hameed:Author

کون تھا جو اسے زندہ دکھائی دیتا۔

''ایک بار آپ نے مجھے اپنی قسم دی تھی......''وہ چل کر باپ کے پاس آئی تھی۔

''آج میں آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں......میری قسم ہے آپ کو والد! کبھی گھاٹیوں کی طرف مت آئیے گا''اس نے ایک آخری بار باپ کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگانا چاہا......اور لگالیا......

انہوں نے جھٹک کر اپنا ہاتھ اس سے الگ کیا''ایسے نہ کہو ودیسا......''

''نہ میرا حال پوچھنے، نہ اپنا حال بتانے۔نہ میری صورت دیکھنے، نہ اپنی صورت دکھانے۔میں آپ کو اپنی قسم دیتی ہوں والد!''

والد کی آنکھوں سے جو اشک رواں تھے۔ہاتھ بڑھا کر اس نے آخری بار وہ آنسو بھی پونچھ دیے۔

''آپ سن رہے ہیں والد؟؟''وہ پوچھ رہی تھی۔

''اب میں زندہ کیسے رہوں گا ودیسا؟؟''وہ بھی پوچھ رہے تھے۔

''میرا غم مت کیجئے گا۔اپنی بیٹی کو یاد رکھیے گا لیکن ودیسا کو بھول جائیے گا۔سمجھ لیں کل رات ودیسا مر گئی اور آج اس کا جنازہ جا رہا ہے۔اگر آپ میرے غم میں مر گئے، تو میں خدا کے سامنے شرمندہ ہوں گی۔کیا آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہیں گے؟''

''تمہارا باپ ناکارہ اور نالائق ہے......وہ تمہیں......وہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا''

''اس وقت آپ بادشاہ بھی ہوتے، آپ کے اختیار میں کل جہاں کی طاقتیں بھی ہوتیں، تب بھی آپ مجھے تکلیف سے نہیں بچا سکتے تھے۔یہ بیماری صرف مجھے ہی نہیں ہوئی، اس بیماری پر آپ اکیلے ہی شرمندہ نہیں ہوئے۔''

''خدا نے میری ودیسا کے ساتھ ایسا کیوں......''

''اس نے اپنی گیلی آنکھیں رگڑ دی۔''خدا......''وہ کہہ کر کتنی ہی دیر تک خاموش رہی تھی۔''یہ سوال تو ابھی مجھ اس سے کرنا ہے۔''

گھر میں پتھر گرنے لگے تھے کہ جلدی نکلو یہاں سے۔والد غصے سے پاگل ہو گئے تھے۔وہ گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر شہر والوں پر پھینکنے لگے تھے۔اس نے لپک کر والد کے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں باندھ دیا۔پھر وہ انہیں اندر لے گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ماں رو، رو کر دیوانی ہو چکی تھی۔وہ ایسے بھٹکتی پھرتی تھی جیسے بینائی کھو بیٹھی ہو۔بہن بھائی ہچکیوں سے رو رہے تھے۔

گھر کے دروازے کے باہر''انسانوں''کا اژدھام کھڑا تھا۔سارا گھر اس نے دیکھے بغیر پار کر لیا تھا، لیکن جب وہ دہلیز پار کرنے لگی تو پلٹ کر ایک نظر اپنے گھر کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔دروازے کی چوکھٹ پر سر ٹکا کر، گردن کو ذرا سا خم دے کر اس نے آخری نظارے کی چوری کی تھی۔

اس گھر میں اب وہ دوبارہ کبھی نہیں آسکے گی۔اس باپ، اس ماں سے وہ کبھی نہیں مل سکے گی۔چھوٹے بہن بھائیوں کا منہ نہیں چوم سکے گی۔اس کی لعنت کے پتھر اس کے خاندان والوں کو نہ پڑیں، وہ ان سب کا نام تک بھول جائے گی۔اپنے گناہوں کا کنارہ دینے وہ جا رہی تھی، اس کنارے میں وہ اپنے خاندان والوں کو شریک نہیں کرے گی۔

Sumaira Hameed:Author

وہ باہر نکلی تو سب پیچھے ہٹنے لگے۔ جو ایک بار ماں کے بد بخت کہنے پر رو دی تھی، وہ لوگوں کی بدبختی بھری گالیاں سن کر بھی خاموش تھی۔ اس کی سہیلیاں دور چوباروں پر کھڑی تھیں۔ ان کی ماؤں نے ان کے ہاتھ سختی سے پکڑ رکھے تھے کہ وہ دبیسا سے لپٹ نہ جائیں۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹیوں کے چہروں پر چادریں کھینچ دیں...... سب توبہ توبہ کر رہے تھے......

ابھی تک بس اسی نے توبہ نہیں کی تھی۔ وہ شہر کے دروازے سے باہر آ گئی تھی۔ گھاٹیوں کی طرف آتے ہوئے اسے پشت پر پہلا پتھر پڑا تھا۔ وہ پلٹی تو دوسرا پتھر عین پیشانی پر پڑا تھا۔ تیسرے کا کونا آنکھ میں لگا تھا۔ چوتھے پتھر سے اس کی ناک سے خون نکلنے لگا تھا۔ خرطوم اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مٹھیوں میں پتھر بھر کر کھڑا تھا، اور تاک تاک کر اس کی طرف اچھال رہا تھا۔

''دبیسا چڑیل...... میں نے کہا تھا نا تو کوڑھی ہو گی تو میں تجھے پتھر ماروں گا......''

ناک پر ہاتھ رکھ کر وہ خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دور شہر کے لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ والد شاید گھر کے اندر مر چکے ہوں گے۔ والدہ خود میت سب کی قبریں کھود رہی ہوں گی۔ اسے پہلے پتھر پر اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی پیشانی پر پڑنے والے پتھر سے ہوئی تھی...... وہ پیٹھ پیچھے کے وار کو سہہ سکتی تھی، یہ سامنے کی دھتکار...... یہ اس سے سہی نہیں گئی تھی......

وہ چلتی ہوئی خرطوم کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ خرطوم کی گردن اکڑی رہی اور آنکھوں سے تندی جھلکتی رہی۔ اب وہ اس سے خوفزدہ نہیں تھا۔ کوڑھ ایسی بد بخت بیماری تھی، کہ انسان کی حیثیت غلاظت سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اس پر تھوکا جاتا تھا، اس سے ڈرا نہیں جاتا تھا۔

''تم نے مجھے پتھر مارا، مجھے برا نہیں لگا، برا تب لگا تھا جب تم نے ضعیفہ کو مارا تھا۔ آج کسی اور کو برا لگا ہو گا، اور جسے لگا ہو گا وہی تم میں سے بہترین ہو گا۔ وہی تو انسان ہو گا۔''

کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھی، خرطوم کے پتھر اسے لگتے رہے تھے۔ اس کی آواز اس کا پیچھا کرتی رہی تھی۔

''تم گھاٹیوں سے باہر نکلیں تو میں تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔ دبیسا چڑیل! میں تجھے شہر کے اندر گھسنے نہیں دوں گا۔''

وہ جانتی تھی وہ ایسا ہی کرے گا کیونکہ اسے روکنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ایک کوڑھ نے سارے شہر کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اسے پتھر ماریں، اس پر لعنتیں بھیجیں۔ ایک بیماری نے اسے اچھوت بنا دیا تھا۔ زمین اس کے لیے تنگ ہو چکی تھی، وہ زمین کی غلاظت ہو چکی تھی...... پتا نہیں کس گناہ کی...... لیکن سزا کڑی ملی تھی......

زمین والوں پر کبھی آسمان والے نے ظلم نہیں کیا...... زمین والوں پر ہمیشہ زمین والوں نے ہی ظلم کیا ہے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

والد نے قسم دی تھی اور وہ کبھی گھاٹیوں کی طرف نہیں آئی تھی۔ وہ اسے اس نامراد بیماری سے بچاتے رہے تھے، اور وہ نامراد ہو کر، اس بیماری میں گھیر کر دوسرے کوڑھیوں میں خود چل کر آ گئی تھی۔ انسان لاکھ تدبیریں کرتا ہے، اور سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

Sumaira Hameed:Author

جس وقت اس نے اس طرف جہاں وہ زندگی میں کبھی نہیں گئی تھی اپنے قدم بڑھائے تو زمین نے جیسے اس کے پیر جکڑ لیے تھے۔ اس کی پشت پر سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا..... سمندر..... کیسا دل دہلا دینے والا تھا..... اس سمندر پر پرندوں کے غول کے غول دائروں میں چکرا رہے تھے۔ ان کی آوازیں..... کان پھاڑ دینے والی..... نفرت انگیز تھیں.....

وہ ایک پتھر پر اپنے ہاتھ رکھ کر، سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ جی چاہا، پتھر سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو ختم کر دے۔ ہوا سے اس کی چادر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کا پرندہ اس کے سر پر چکرا رہا تھا۔ شاید اسے ابھی بھی اپنی دبیسا پر فخر تھا..... زمانے کی زبانیں اسے گالیاں دینے لگی تھی..... لیکن وہ اس کے لیے ابھی بھی گنگنا رہا تھا..... اجنبی زمین کا آسمانی پرندہ..... وہ اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔

وہ کانپ رہی تھی۔ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ اس کی پیشانی کا زخم اسے بہت زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ جسم میں در آنے والی بیماری اسے اتنی بری نہیں لگی تھی، جتنے جسم پر پڑنے والے پتھر۔ زم زبانوں کی، انگارہ باتوں نے اسے راکھ کر دیا تھا۔

اسے گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگی..... اپنی طرف آتے بہت سے قدموں کی چاپ۔ سہارے کی لکڑیوں کی ٹھک ٹھک۔ وہ خوف سے سُن کر رہ گئی تھی۔ جن لوگوں کو دیکھ کر وہ اپنا راستہ بدل لیتی تھی، آج ان لوگوں کا اور اس کا راستہ ایک ہو چکا تھا۔ جن لوگوں کو دیکھ کر وہ ناک تک چادر کھینچ لیتی تھی، اب انہی لوگوں میں اسے آخری سانس تک رہنا تھا۔ وہ اپنا خاندان، اپنا باپ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اب یہ لوگ اس کا خاندان بننے والے تھے۔ انہی کے ساتھ وہ، اٹھے، بیٹھے، کھائے پیئے گی۔ مرے گی تو یہی لوگ اس کا ماتم کریں گے۔ یہی اسے دفنائیں گے اور یہی لوگ اسے یاد کرتے کرتے بھول بھی جائیں گے۔

والد شہر کے معززین میں سے تھے۔ اس کا گھر شہر کے چند بڑے گھروں میں سے ایک تھا۔ اب یہ گھاٹیاں اس کا گھر تھیں۔ چوہوں کا مسکن اس کا بستر، غلاظت کے ڈھیر اس کی آزمائش۔ تنگ سرنگیں، تاریک غاریں، بدبودار گھاٹیاں، اس کا پورا نصیب۔

گھنٹیوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ اس سے ذرا دور تھم گئی تھیں۔ شاید ان لوگوں تک شہر کے لوگوں کا شور پہنچ چکا تھا۔ یا پھر ان کی بیماری زدہ، کوڑھ حسیوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک اور بد بخت، نامراد ہو کر ان کے ساتھ رہنے کے لیے آ چکا ہے۔

خوف دل پر حاوی تھا، ہم سے سانس تنگ تھی۔ پتھر کی ڈھلان پر جھک کر کھڑی، وہ پتھر ہو چلی تھی۔ وہ ان سب کے غلیظ پیر دیکھ رہی تھی۔ بدبودار لبادے، زخم خوردہ کھالیں۔

''یا خدایا..... دبیسا..... ''ضعیفہ نے جیسے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا۔ اس پر بجلی گری تھی۔

اس نے سر اٹھایا۔ آگے پیچھے کھڑے کوڑھیوں کو دیکھا۔

''ہاں دبیسا..... لعنتی دبیسا..... ''سر کو پتھر سے ٹکرا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

شہر والوں نے اسے نکال دیا، وہ شہر سے نکل گئی۔ وہ اسے بھول گئے، وہ بھی انہیں بھول گئی۔ اس کا ذکر، قصہ کہانی بن گیا۔ اس کا نام ناپاک کہلایا۔ اس کا انجام عبرتناک قرار پایا..... یہ زمانہ..... یہ لوگ..... یہ وقت کی چال..... یہ او پروالے کا کھیل.....

وہ تاریک غار نما سرنگ میں ضعیفہ کے ٹھکانے میں پڑی رہتی تھی۔ ساری دنیا اس کے لیے خاک ہو چکی تھی۔ اس نے خدا سے یہ سوال بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔ اس کے شہر اور آس پاس کے شہروں کے کوڑھی ان ہی گھاٹیوں میں رہتے تھے۔ یہ کوڑھیوں کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اگر کہا جائے کہ زندہ تو ہاں وہ یہیں زندہ رہتے تھے۔ زندگی پر تو تندرست انسانوں کو حق تھا اور وہ کوڑھی تھے، اس لیے موت پر اپنا پورا حق جما کر، اس کے انتظار میں گھڑیاں، وہ یہیں گنتے تھے۔ زندگی پر ان کا بس اتنا ہی حق بچا تھا کہ وہ بھیک مانگتے تھے، اور روٹی نہیں تو ایک لقمہ کھا لیتے تھے۔ دوا تھی نہیں، شفا کے وہ حق دار نہیں تھے...... بچی موت...... تو وہ اس نعمت کے انتظار میں آنکھیں بچھا کر رکھتے تھے......

اس کے حسن کو گھن لگ چکا تھا۔ وہ مری نہیں تھی اور زندہ بھی نہیں رہی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ اپنے جسم پر پڑنے والے داغ دیکھتی رہتی تھی۔ اپنا جسم، اپنے ہاتھ پاؤں۔ پانی میں اپنا عکس دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی تھی۔ اس نے اپنے حسن پر کبھی غرور نہیں کیا تھا۔ پھر بھی...... اس کا حسن خاک ہو رہا تھا۔ کوڑھیوں کو عبادت کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بد بخت اور لعنتی تھے۔ خدا کی طرف سے دھتکارے ہوئے۔ وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ وہ بھیگ مانگتے تھے تو اپنے گناہ کے نام پر جس کی وجہ سے انہیں کوڑھ نصیب ہوا تھا۔ خدا کے نام پر نہیں۔

اگلے دن صبح، والد پاگلوں کی طرح گھاٹیوں سے کچھ دور دیبسا دیبسا چلاتے، بھاگتے دوڑتے پھرتے تھے۔

''میں نے تمہاری دی قسم نہیں توڑی دیبسا! میں گھاٹیوں سے بہت دُور کھڑا ہوں۔ تم نے کہا تھا میں تمہاری صورت نہ دیکھوں، اپنے باپ کو اپنی آواز سنا دو...... دیبسا...... تمہارا باپ مر جائے گا......''

''اپنے باپ سے تو مل لو دیبسا......'' اسے وہاں دیکھ کر بڑھیا رو دی تھی۔ ضعیفہ کچھ زیادہ ہی آبدیدہ تھی۔

''آج مل لیا تو وہ ہر روز یہاں آیا کریں گے۔ وہ یہیں رہ جائیں گے۔ لوگوں کے طعنے ان کا سینہ چھلنی کرتے ہوں گے۔ میرا گناہ، ان کی سزا بن چکا ہے۔ گھاٹیوں کو میں ان کے لیے جہنم نہیں بننے دوں گی۔'' اس نے گیلی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا تھا۔ والد کی آواز کی گونج اسے تکلیف دے رہی تھی۔ دنیا جہاں کے پہاڑ اس نے اپنے سینے پر رکھ لیے تھے۔ باپ کی آواز کا کانوں سے نہیں پا رہی تھی۔ وہ سرنگ میں اتنی دور چلی گئی تھی کہ اسے والد کی آواز سنائی دینا بند ہو گئی تھی۔

''دیبسا نے کہا ہے کہ اگر آپ دوبارہ یہاں آئے تو وہ سمندر میں کود کر اپنی جان دے دی گی۔'' ضعیفہ نے دیبسا کا پیغام والد تک پہنچا دیا تھا۔ ''اس نے کہا ہے کہ وہ اپنی زبان کی ایسی پکی ہے، کہ آپ کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دی تو وہ کود جائے گی۔''

''میری جان لے لی اس نے...... اب اپنی جان لے کر کیا کرے گی۔'' والد زیر لب بڑبڑائے۔ انہوں نے آس پاس پڑے پتھر چننا شروع کر دیے تھے۔ کہ اگر ان کی دیبسا یہاں سے گزرے، اور کوئی اسے پتھر مارنا چاہے تو کسی کو اسے مارنے کے لیے پتھر نہ ملے۔

انہوں نے زیر لب دیبسا، دیبسا کی تکرار شروع کر دی تھی...... نہ کرتے تو سانس کیسے لیتے......

☆ ...... ☆ ...... ☆

''دیکھو تمہارا پرندہ آیا ہے۔''

حنیفہ نے دبیسا کو پرندے کی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا۔ چادر کو منہ تک اوڑھ کر وہ پتھریلی زمین پر بچھی خشک گھاس پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں مردوں کی طرح اندر کو دھنس چکی تھیں۔ جسم کی کھال کا وہ حال ہو چکا تھا کہ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔

''تمہارا پرندہ تم سے ملنا چاہتا ہے......'' اس نے پھر کہا۔

''تم ہر روز میرا سر کیوں کھاتی ہو؟ کیا اس جہنم میں بھی مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''سکون انسان کے اندر ہوتا ہے دبیسا! اگر اسے اندر سے سکون نہ ملے تو کہیں سے نہیں ملتا۔ ٹھیک ہے ہم پر خدا کی لعنت پڑ چکی ہے، لیکن اس کے باوجود، جیسے کوئی میرے اندر کہتا ہے کہ روئے زمین پر موجود سب انسانوں میں، میں خدا کی رحمت کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میری روح سے صدائیں اٹھتی ہیں کہ خدا ہم پر کسی بھی دوسرے انسان سے زیادہ مہربان ہے۔''

دبیسا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''وہ خدا جو ہمیں کوڑھ دے کر شفا دینا بھول گیا ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''چھوڑو! سر اٹھا کر اپنے پرندے کو دیکھو۔ کیا خوب صورت اور جوشیلا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ تمہارا فرشتہ ہے۔ تمہیں خدا کا پیغام دینا چاہتا ہے...... ہمارے پاس خوش ہونے کے کتنے محدود بہانے ہیں دبیسا! یہ پرندہ ہر روز تمہارے سر پر آ کر منڈلاتا ہے۔ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو سکتی کہ یہ تمہارا دیوانہ ہے۔ جہاں انسان ہمیں دیکھتے ہی پتھر مارنے لگتے ہیں، یہ تمہیں دیکھتے ہی دیوانہ وار اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ تم تو ابھی بھی بہت خوش قسمت ہو، مجھے دیکھو میرا سایہ پڑتے ہی حشرات تک بھاگ جاتے ہیں۔'' کہہ کر قہقہہ لگایا۔

اس نے سر اٹھا کر پرندے کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وہی پرندہ ہے جس کے پیچھے وہ گھر سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ دبیسا کا پرندہ ہے۔

''تمہیں کیسے پتا کہ یہ میرا ہی پرندہ ہے؟'' آج اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''جو جس کا ہوتا ہے وہ دکھائی دے جاتا ہے...... جیسے...... یہ زمین ہماری نہیں ہے...... لیکن ذرا سر اٹھا کر دیکھو، وہ آسمان ہمارا ہے...... اپنی چیزیں، اپنی طرف کھینچتی ہیں دبیسا! کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟''

دبیسا نے سر اٹھا کر دیکھا...... کتنی ہی دیر تک وہ اوپر دیکھتی رہی تھی...... پھر پرندہ اس کی نظر کی سمت پر جا کر اڑنے لگا تھا۔

''کیا تمہیں آسمان اپنی طرف نہیں کھینچتا؟'' پرندہ بھی یہی پوچھ رہا تھا۔

''خدا اس بندے پر لعنت کیسے بھیج سکتا ہے، جس کا وہ واحد ''خالق'' ہو؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ سوال سے ہی سہی، اس نے خدا سے کلام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پرندے نے ہوا میں جوش سے ترچھی اڑان بھری۔ وہ خوش تھا۔ اس کے سر کے اوپر، آسمان کے نیچے...... وہ سفید تھا۔ حضرت نوحؑ کے بھیجے پرندے کی طرح، جو کشتی سے زندگی کی نوید لینے نکلا تھا، اور چونچ میں سبزا لیے، بامراد واپس پلٹا تھا...... اس کا پرندہ...... وہ بھی بامراد واپس پلٹنے والا تھا......

☆ ...... ☆ ...... ☆

Sumaira Hameed:Author

دنیا کے ہر انسان کا، پوری زمین پر پورا حق تھا، لیکن ان جیسے بیماروں کا، صرف اس تاریک، نوکیلے، بدبودار حصے پر حق تھا۔ رزق حلال پر بھی ان کا حق نہیں رہا تھا کیونکہ انہیں کوئی کام کیوں دے گا؟ وہ ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگ سکتے تھے...... انہیں خیرات نہیں دی جائے گی، ان کی امداد نہیں کی جائے گی، کیونکہ وہ خدا کی طرف سے پھٹکارے گئے تھے۔ وہ بازار میں خرید و فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں کوڑا کرکٹ میں سے چیزیں چننی پڑتی تھیں۔ وہ کسی صحت مند انسان کا راستہ نہیں کاٹیں گے۔ ہوا کے مخالف سمت چلیں گے۔ مخصوص کپڑے پہنیں گے، گھنٹیوں کا شور کیے بغیر نہیں چلیں گے، خدا پر اپنا حق نہیں جتائیں گے، اسے پکارنے کی جرات نہیں کریں گے۔ بدبخت۔

وہ ضعیف تھا، اور بھوک سے مجبور ہو کر سرائے کی طرف گیا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر سے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں کیسے وہ ایک بچے سے ٹکرا گیا تھا۔ بچہ اس کے جسم کے نیچے دب گیا تھا۔ بچے کی چیخوں سے سارا شہر لرز اٹھا تھا۔ اسے بچے کی جان اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بچے سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک کوڑھی ہی تو چاہتا تھا، کہ اب اس کے بعد کوئی اور کوڑھی نہ ہو۔

جب وہ لوٹا تھا تو زخموں سے چور اور لہولہان تھا۔ سب سے بری حالت اس کی آنکھ کی تھی، جو پتھر کی ضرب سے پھوڑ دی گئی تھی۔ ضبط کے سب سمندر پی چکنے کے باوجود وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔ گھاٹیاں اس کی کراہوں سے گونج رہی تھیں۔

باقی سب چپکے چپکے اپنے آنسو صاف کر رہے تھے۔ دعا ان کے پاس کہاں ہوتی تھی۔ ان کے پاس تو ''دعا'' بھی نہیں رہی تھی۔ دبیسا اونچی گھاٹی پر بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بوڑھے کا واویلا چپ چاپ سنتی رہی تھی۔ یہ تو ہر روز کا معمول تھا، کوئی نہ کوئی ایسے ہی بلبلاتا ہوا واپس آتا تھا۔ وہ تکلیف کے سمندر میں غرق تھے، ان کے پانیوں میں پتھر پڑتے ہی رہتے تھے۔ وہ کراہتے، روتے، بلبلاتے ہی رہتے تھے۔

بہت دیر بعد وہ نیچے اتری تھی۔ بوڑھے کی حالت دیکھ کر اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ گھٹنوں کے بل، پتھریلی زمین پر بوڑھے کے بستر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ایک گندی سی پٹی اس نے اپنی آنکھ پر لپیٹ لی تھی۔ لیکن خون تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تکلیف تھی کہ بے چارے کو کسی پل چین نہیں تھا۔

''میں نے پوچھا کیا ہوا؟'' وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ وہ سب جانتی تھی کیا ہوا ہو گا لیکن پھر بھی پوچھ رہی تھی۔

''تم اندھی تو نہیں ہو...... نظر نہیں آ رہا کیا......'' ضعیفہ کو اس کے چلانے پر غصہ آ گیا تھا۔

''آپ نے وہی پتھر اٹھا کر ان کے سروں پر کیوں نہیں دے مارا؟؟'' وہ بھڑک اٹھی تھی۔ غصے کی زیادتی سی کانپنے لگی تھی۔

سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ بھلا ایسی بات بھی وہاں کوئی کرتا تھا۔

''دوبارہ یہاں کوئی پتھر کھا کر واپس نہیں آئے گا...... سن لیں سب......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر للکار کر کہا۔

پرندہ پوری شدت سے اپنے پر پھڑپھڑانے لگا تھا۔ زمانے گزر گئے تھے، پرانی دبیسا اب زندہ ہوئی تھی۔ پرندہ گھاٹیوں سے نکل کر شہر کی طرف جا رہا تھا...... دبیسا نے پرندے کو شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ اس طرف نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ چکی تھی۔ پھر اس نے اپنے قدم بھی پرندے کے پیچھے پیچھے بڑھا دیے......

Sumaira Hameed:Author

حنیفہ اسے روکتی رہ گئی تھی لیکن وہ چادر کو سر پر کھینچ کر شہر کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ سارے شہر کو آگ لگا دے گی۔ پتھر مار مار کر، ایک ایک کا سر پھوڑ دے گی۔

''بوڑھے کو کس نے مارا ہے؟؟'' وہ چلا کر پوچھ رہی تھی۔ سرائے سے آدمی باہر نکل آئے تھے۔ اس نے منہ تک چادر نہیں کھینچی ہوئی تھی۔ اس کی گھنٹیاں بھی غائب تھیں۔ وہ ہوا کے رخ پر کھڑی تھی ...... سامنے ......

''تمہارے باپ کی وجہ سے تمہارا لحاظ کیا جاتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم شہر میں دندناتی پھرو۔ ابھی بھی عقل ٹھکانے نہیں آئی تمہاری۔'' وہ سب اپنی ناک پر ہاتھ رکھ چکے تھے۔

''میری عقل ٹھکانے آ چکی ہے، تمہارا ایمان ٹھکانے آنے والا ہے۔ میں اس انسان کا سر کچل کر رکھ دوں گی جس نے اس بوڑھے کی آنکھ پھوڑی ہے۔ میں کوڑھی ہوں، اپنے منہ سے ایک ایک کو کاٹ کر، اپنی طرح کا کوڑھی کر دوں گی۔ پتھر مارنے والے تمہارے بچوں کی گردنوں میں دانت گاڑ دوں گی۔ خون پی جاؤں گی سب کا ...... یاد رکھنا ...... میرا نام یاد رکھنا ...... دیبیا ......'' اس نے بڑھ کر ذرا دور کھڑے ایک بچے کا ہاتھ دبوچ لیا تھا۔

''ہم نے رحمدلی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا ...... اگر تم پتھر مارو گے تو ہم بھی ماریں گے۔ تم خدا کے پیارے ہو، تو ہم خدا کی طرف سے پھٹکارے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سب ایسے ہے تو، پھر یہ ایسے ہی ہوگا۔'' اس نے منہ کھول کر بچے کا ہاتھ دانتوں سے کاٹنا چاہا تو اس کا باپ چلا اٹھا۔

''بدبخت! میرے بچے کو چھوڑ دے۔'' وہ بلبلا اٹھا تھا۔

وہ ہنسی اور اس نے جھٹک کر بچے کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ ''دوبارہ یہاں سے پتھر آئے، تو میں آگ لے کر آؤں گی ...... کوڑھ کی آگ ...... جلا کر راکھ کر دوں گی ...... اپنی زبانیں انگارہ ہی رکھو، لیکن ہاتھ باندھ لو۔ بھیک نہ دو، اور ذلت بھی روک لو۔ رحم نہ کرو اور انسانیت کا کھوکھلا نقاب اوڑھ لو ...... مجھے جان سے مار دو ...... لیکن یہ یاد رکھو، اب اگر کسی کوڑھی پر ہاتھ اٹھا تو میں وہ ہاتھ کاٹ کر لے جاؤں گی۔''

کتنے ہی لوگوں نے بھڑک کر اسے پتھر مارنے چاہے تھے وہ اسے ڈرانا چاہتے تھے، لیکن وہ دیبیا تھی، اس کی آواز کی گونج ان کے دل دہلا رہی تھی ...... وہ واقعی میں ان کی گردنیں کاٹ لے گی۔ وہ ان کے سینوں سے دل نوچ لے گی۔ جیسے وہ بات کر رہی تھی، اس کی دہشت بتا رہی تھی، وہ ایک ایک کو کوڑھی کر دے گی۔

''میں خدا کا عذاب ہوں نا ...... اب اس عذاب میں، میں تمہیں بھی حصہ دار بناؤں گی ......'' کہہ کر وہ شہر سے باہر آ گئی تھی۔ اس کا دکھ اور غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک کوڑھ ...... بس ایک بیماری ...... اور ساری دنیا شیطان بن گئی تھی، سارا جہاں جہنم بنا دیا گیا تھا۔ بیماری پر ان کا اختیار نہیں تھا، اور رحم پر ان بے رحموں کا۔

وہ واپس آئی تو بوڑھے کے بستر کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ زخموں سے اتنا چور چور نہیں تھا، جتنا اپنی بدنصیبی سے تھا۔ وہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ دیبیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جیسے وہ والد کا پکڑا کرتی تھی۔ اس کی محبت کے ایسے اظہار پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ آنسوؤں کا

Sumaira Hameed:Author

گولہ وییسا کے حلق میں پھنس گیا تھا...... اور ٹھیک اسی وقت وییسا کا پرندہ اس کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا تھا...... وییسا نے سر کو ذرا سا خم دے کر اسے دیکھا...... اس نے اپنا پر لہرایا تو وہ وییسا کے گیلے گال سے ٹکرایا......

بے رحموں کی زمین پر ''رحم کا پرندہ''...... وہ وییسا کو خدائی پیغام دینے جا رہا تھا۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

''خدا ہمارا کیوں نہیں رہا...... اس نے ہمیں چھوڑ کیوں دیا......؟''

یہ سوال، اس نے آنے والے ہر دن، خود سے کیا تھا۔ غار کے دہانے پر بیٹھ کر، سرنگ کی تاریکیوں میں بھٹک کر، سمندر کی ہوا کے تھپیڑے کھا کر، دھوپ کی تپش سہہ کر، رات کی تنہائی اور دن کی سختیاں جھیل کر۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، یہ سوال اس کے اندر چنگاری سے آگ بنتا جا رہا تھا۔ ساری دنیا نے اسے چھوڑ دیا لیکن خدا نے کیوں چھوڑا...... دنیا سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، لیکن خدا تو اس کا تھا۔

دن کے پہر، رات کے پہر، اس نے اپنی پوری ہستی اس سوال میں ڈھال دی تھی۔ اسے کوڑھ سے شفا نہ ملے لیکن اس سوال کا جواب مل جائے۔ جس خدا نے اسے اپنا بندہ بنایا...... پھر اس نے اسے لعنتی کیوں بنا دیا؟

اسے پتھروں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ سر کے پیچھے زخم بن چکے تھے۔ نہ وہ عادت چھوڑ رہی تھی نہ زخم مندمل ہو رہے تھے۔ ان کے زخم ویسے بھی مندمل نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس دن بھی وہ ایک تنگ منہ والی غار کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، کہ اس کا پرندہ اس کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''تم بھی بالکل مجھ پر گئے ہو۔ ہر وقت آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔''

''پر تم تو یہاں پتھروں سے سر جوڑ کر بیٹھی رہتی ہو۔'' ضعیفہ نے مذاقاً کہا۔

اس نے انگلی سے اپنا سر ٹھوکا۔ ''یہاں...... یہاں سے میں پتا نہیں کہاں کہاں پہنچ جاتی ہوں۔''

''تو پھر تمہارے پرندے کو بھی وییسا کہا جانا چاہیے......''

وہ ذرا سا چونکی۔ ''مجھے اس کے اشارے پسند ہیں، یہ اچھے راستے دکھاتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے ''حدا'' کہا جانا چاہیے......''

''حدا...... اچھا نام ہے...... راستہ دکھانے والا۔ واہ، تمہاری ذہانت لوٹ آئی ہے۔''

وہ تلخی سے ہنس دی۔ ''ذہانت، عقل و شعور، جرأت...... یہ سب خواب تھے جو میں نے کبھی دیکھے تھے۔''

حدا پھر اڑا تھا۔ دور آسمان پر پرندوں کے غول کسی ایک جگہ کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ وہ اتنے زیادہ تھے کہ سارے آسمان پر چھا گئے تھے۔ حدا بھی اسی طرف گیا تھا۔

''جاؤ اپنے حدا کے پیچھے......'' ضعیفہ نے ہنس کر کہا۔ ''نکل جاؤ اس کے ساتھ آوارہ گردی کرنے۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شاید اس طرف کوئی جانور مر گیا تھا، جس کے گرد پرندوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ قدم قدم وہ اس طرف جا رہی تھی۔ پہلے وہ بلندی پر چڑھی، پھر ڈھلان اترنے لگی تھی۔ کچھ پرندے زمین پر اتر رہے تھے، کچھ ہوا میں دائروں میں چکرا

Sumaira Hameed:Author

رہے تھے۔ سارا واویلا نیچے ڈھلان پر مچا تھا۔ خدا اسے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکی تھی ..... اور ڈھلان اترتے اترتے ایکدم سے قدم روک کر کھڑی ہوگئی تھی .....

جس کی آنکھ پھوڑ دی گئی تھی، وہ زندگی سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند چکا تھا۔

وہ گہرا سانس کھینچ کر بوڑھے کے قریب آئی۔ جو جیتے جی مر چکا تھا، اب وہ واقعی میں مر چکا تھا۔ بھلا ایک کوڑھی کے مرنے پر پرندوں کی آمد کا کیا مقصد تھا۔ اتنا واویلا کس لیے؟ زمین جو اس کی سانسوں پر تنگ تھی، اب اس کے مردہ وجود پر بھی تنگ رہے گی۔ چپ چاپ کھڑے وہ کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا، اس کے زخموں سے خون رستا رہا تھا، لیکن اب اس کے انہی زخموں سے سکون برس رہا تھا۔ ابدی سکون ..... دنیا میں اس وقت کہیں تھا تو وہ بوڑھے کے مردہ چہرے پر تھا۔ وہ اتنا خوش دکھائی دیتا تھا، جتنا ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کی موت کی ایک ایک نشانی گواہی دے رہی تھی کہ اسے دنیا سے رہائی نہیں ملی،

''اسے خدا مل گیا ہے.....''

کھڑے کھڑے وبیسا نے آس پاس نظر دوڑائی۔ اس روشنی پر جو بوڑھے کے مردہ وجود پر پڑ رہی تھی۔ اس زمین پر جو ابھی بھی دلدل نہیں بنی تھی۔ اس ہوا پر جو ایک زندہ کوڑھی، اور مردہ کوڑھی پر ہمیشہ کی طرح مہربان تھی۔ اگر خدا انہیں چھوڑ چکا تھا تو اس نے ان کی ہوا کیوں نہیں چھین لی؟ ان کی روشنی؟ اگر وہ ایسے ہی بدبخت تھے تو ان کے بدبخت دل آسمان کی طرف کیوں کھنچتے تھے؟ اگر وہ ایسے ہی ناپاک تھے تو ان کے ناپاک دلوں سے ''خدا'' کا نام مٹ کیوں نہیں گیا تھا؟ شیطان پر جب لعنت بھیجی گئی تھی تو اسے توبہ کی توفیق سے ہی خارج کر دیا گیا تھا، ان پر لعنت بھیجی گئی تھی تو بھی ..... تو بھی

وہ گھٹنوں کے بل جھک کر بوڑھے کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا مردہ ہاتھ تھام لیا۔ ''اگر خدا نے واقعی میں ہمیں چھوڑ دیا ہے، تو اس نے ہم کوڑھیوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لیے رحم سے کیوں بھر دیا ہے۔ اس نے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا کیوں بنا دیا ہے۔ ہماری ناپاک روحوں کو اس نے، رحم کی پاکیزگی سے کیوں نوازا ہے؟؟'' وہ سسکنے لگی تھی۔ بوڑھے کی موت پر نہیں، اپنے سوال کی زندگی پر۔

اسے سب سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ زمین پر بچھی ہر شے، آسمان تک بلند ہر شے نے اسے جواب دے دیا تھا۔

''خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا ..... بلکہ اس نے ہمیں اپنے قریب کر لیا ہے۔''

وہ بھاگ کر گھاٹیوں میں واپس آئی اور اس نے چلا کر کہا۔ وہ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر کھڑے اسے حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

''ہماری زبانیں ناپاک ہے، نہ ہماری روحیں غلیظ ہیں۔ ہم لعنتی ہیں نہ بدبختی ہمارا مقدر ہے ..... یہ ان انسانوں .....'' اس نے شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ان انسانوں کی بنائی قصہ کہانیاں ہیں۔ یہ ان کی اور ہماری آزمائش ہے۔ وہ اپنی آزمائش میں نالائق رہے، ہم اپنی آزمائش میں صابر رہے ..... دیکھو سورج کو، جو ہماری رات کو صبح میں بدلتا ہے۔ اس ہوا کو محسوس کرو، جو ہمارے زخموں کو سہلاتی ہے۔ اور نیند ..... ہماری آنکھوں سے نیند جدا نہیں ہوئی ..... اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ''نیند''۔ ہمارے نبیوں نے ہمیں سکھایا کہ اللہ کی

Sumaira Hameed:Author

مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ''نیند'' ہے۔ خدا نے اس نعمت کو ہم سے جدا نہیں کیا۔ خدا نے ہم سے کچھ نہیں چھینا..... جو کیا..... اس زمین کے انسانوں نے کیا۔''

''لیکن اس نے ہماری تندرستی چھین کر اسے بیماری میں بدل دیا.....''

وہ بھاگ کر ضعیفہ کے پاس آئی تھی۔ ''یاد کرو، تم نے مجھے خدا کی مرضی زمین پر لانے کے لیے کہا تھا۔ پھر یہ بات تم خود ہی بھول گئی تھی۔ خدا کے حکم سے یہ بات تمہارے منہ سے نکلی تھی۔ یہ خدائی اشارہ ہے..... یہ سب خدائی اشارے ہیں۔ اس آسمان کا خدا، کل بھی ہمارا تھا اور آج بھی ہمارا ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ وہی دبیسا بن چکی تھی جو والد کے ہاتھ باندھ دیا کرتی تھی اور جو والد کو ناامیدی سے ڈرایا کرتی تھی۔

''آؤ سب مل کر اپنے رب کو پکاریں کیونکہ وہ یہی چاہتا ہے۔ اپنی چاہت کے لیے اس نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں دنیا سے الگ کر کے، ہماری روحوں کو رحم سے بھر کر، ہمیں تکلیف سے گزار کر، ہمیں خاک سے نور کر کے، ہمیں بدتر سے بلند کر کے، ہمیں کوڑھ سے اپنے قریب کر کے..... وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے پکاریں..... ہمارے رب نے ہمیں چنا ہے۔ ہمیں اس کے انتخاب پر شکر یہ ادا کرنا ہے۔''

سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے..... وہ اتنی خوش تھی کہ زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی.....

''آؤ اسے ایسے پکاریں کہ اس کی مرضی، ہمارے لیے معجزہ بن جائے۔ کوڑھ کو شفا اور ہمیں ہمارا ''خدا'' مل جائے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

''امید یقین میں اور یقین معجزوں میں بدلتے ہیں حدی!'' فرشتہ کہہ رہا تھا۔

''اللہ نے میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا؟'' ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا سوال کیا تھا۔

وہ ہاسپٹل جا چکی تھی۔ ہاسپٹل میں تین دن کومہ میں رہنے کے بعد ہوش میں آئی تھی۔ تین ہفتے..... وہ اس اور اُس زندگی کے درمیان رہی تھی۔ اور ایک دن اللہ سے قریب رہنے کے بعد، وہ اس سے دس قدم دور ہو چکی تھی۔ تکلیف ملتی ہے تو پہلا سوال ''کیوں'' ہوتا ہے۔ ''میں ہی کیوں''، مجھے پر ہی کیوں؟ مصیبت آتی ہے تو قدم ایمان سے پیچھے کی طرف کھسکتا ہے..... ہوتا ہے تو یقین، بے یقینی میں بدل جاتا ہے۔

''تم اتنی آسائشوں میں پیدا ہوئیں۔ تمہیں دنیا جہاں کی نعمتیں، راحتیں میسر رہیں۔ تم پوری طرح سے تندرست رہی، تب تم نے اللہ سے سوال کیا کہ اس نے تمہیں اتنا کچھ کس لیے دیا؟ اور کیوں؟ جو انسان ناشکری کرتا ہے، برا وہ نہیں ہے، برا وہ ہے جو کبھی شکر گزار ہی نہیں ہوا۔ عجیب وہ نہیں جس کے پاؤں میں کبھی کانٹا نہیں چبھا، عجیب وہ ہے جو سو دن مخملی گھاس پر چلا اور ایک دن اسے کانٹا چبھ گیا اور اس نے سو دن بھلا کر، ایک اس دن کو یاد کر لیا۔ اس کانٹے کو اپنا روگ بنا لیا۔''

''کیا تکلیفیں زندگی کی قیمت ہیں؟'' وہ سسکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔

''کیا راحتیں زندگی کی حقیقت ہیں؟'' وہ بھی پوچھ رہا تھا۔

Sumaira Hameed:Author

وہ شکایتی انداز سے فرشتے کو دیکھ رہی تھی۔''کیا انسان تکلیف پر رو بھی نہیں سکتا۔''

''رونے اور واویلے میں فرق ہوتا ہے۔''

''میں کبھی مذہبی نہیں رہی۔ کیا یہ اس کی سزا ہے......کیا......کیا میں کافر اور گناہگار ہوں؟ یہ اس سب کی سزا ہے؟''

''فرشتے نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔''تم نے ایسی خوفناک بات کہاں سے سیکھی؟''

وہ جھجکی تھی۔''مسجد میں کچھ لڑکیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ ان کی باتیں میں نے سن لی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں بھٹکی ہوئی ہوں۔ میں کافر، اور گناہ گاہ ہوں۔ اللہ نے مجھے میرے اعمال کی سزا دی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر بندہ اپنے رب کی طرف سیدھی طرح سے نہ آئے تو اسے طوعاً و کرہاً آنا پڑتا ہے......اور کینسر مجھے گھسیٹ کر خدا کے پاس لے آیا ہے۔''

فرشتے نے ایک گہری سانس لی تھی۔''طوعاً و کرہاً......خوشی سے ورنہ زبردستی......اس دنیا کے انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ جس کام کا اسے اختیار ہی نہیں دیا گیا، یہ اسی کام کو کرتا ہے۔ دوسروں کے اعمال کا حاصل جمع نکال کر انہیں ان کا انجام بتانے کا۔ وہ جنتی ہیں یا جہنمی، انہیں یاد دلاتے رہنے کا۔

جن لوگوں نے دیسا کو پتھر مارے، اسے لعنتی اور سیاہ کار کہا، ان لوگوں کی نسلیں ختم نہیں ہوئیں۔ وہ اس صدی میں بھی زندہ ہیں۔ وہ آج بھی بیماروں کو، ''اعمال کی سزا'' کا عندیہ دے رہی ہیں۔ وہ آج بھی ''تم بھٹکے ہوئے تھے، تمہیں اپنی طرف بلانے کے لیے اللہ نے، یہ مصیبت نازل کی ہے'' کے پتھر مار رہے ہیں۔ طوعاً و کرہاً، ورنہ گھسیٹ کر......یہ اس صدی کے انسان کے کنکر ہیں......

تم نے اپنے رب کے بارے میں ایسا گمان کیوں کیا صدی؟ حضرت ایوبؑ تیس سال تک بیمار رہے تھے۔ وہ پہلے سے ہی اللہ کی طرف متوجہ تھے......پھر وہ بیمار کیوں ہوئے؟ لاکھوں، کروڑوں بچے پیدا ہوتے ہی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ اللہ ان سے ناراض ہوتا ہے؟ یا وہ اللہ کی حکم عدولی کرتے ہیں؟

سب سے زیادہ مشکلیں نبیوں، پیغمبروں نے جھیلیں ہیں۔ سیدھا راستہ دکھانے والوں کے راستے ہمیشہ کٹھن رہے ہیں۔ تو کیا اللہ ان سے ناراض تھا اس لیے ان کے راستے میں مشکلیں رکھ دیں؟ آج کی اس دنیا میں بھی، جو جتنا سچا، ایماندار، پاکباز ہے، وہ اتنی ہی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے......اس لیے کہ صدی کہ نیکی کا راستہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے ہی ان کا مقام بلند ہوتا ہے۔ کیا تم نے سوچا کہ وہ تمہیں عام سے خاص کرنا چاہتا ہے؟؟

''مجھے......؟؟ کس لیے؟ میں نیک اور اچھی والی لڑکی نہیں ہوں۔''

''دینے والے کی ''چاہت''۔ اس کی چاہت کہ تمہیں اپنی بندگی کے لیے بنایا، اس کی چاہت کہ تمہیں بلند مقام کے لیے چنا ہے۔''

وہ چونک گئی۔''اللہ کی چاہت......میں؟''

''کیوں نہیں......اللہ کی چاہت، یہی ہے انسان کا اصل نصیب۔ تم نے اپنی بیماری کو اس کی چاہت سے کیوں نہیں دیکھا۔ وہ مت سوچو جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم سوچو۔ اپنے رب کو اس گمان کے ساتھ نہ رکھو، جس گمان پر انہوں نے رب کو رکھا ہوا ہے۔ تم گناہ گار ہو، سیاہ

Sumaira Hameed:Author

کار ہو، نیک ہو، اچھی یا بری، جو بھی ہو، اس فیصلے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کے پاس رہنے دو۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری، اسے اللہ کا قہر یا عذاب سمجھنا چھوڑ دو۔ جب بادلوں کا سینہ شق ہوتا ہے تو آب برستا ہے۔ ہر شے جو ٹوٹتی ہے، وہ ایک نئی صورت میں بدل جاتی ہے۔ بیج کا انتشار، جڑ اور تنے کی صورت میں ڈھلتا ہے۔ کونپلیں، پتے، پھول، درخت، جنگل، سبزہ...... یہ انقلاب بیج کی توڑ سے برپا ہوتا ہے...... ذرا سوچو کہ اگر بیج اپنا سینہ باندھ کر بیٹھ جائے اور خوف سے خود کو سمیٹ لے تو کیا یہ انقلاب ممکن ہے؟ زمین کا سینہ شق ہوتا ہے تو جہاں، باغ و بہار ہوتا ہے۔ زمین پر ایڑیوں کی ضرب پڑتی ہے تو چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ ماں پر تکلیف کا باب کھلتا ہے، تو ہی نئی روح کو راستہ ملتا ہے...... نئی روح...... ایک اور انسان...... ایک اور مقام......

ایمان کے لیے انسان کا سینہ شق کرنا پڑتا ہے۔ جاہلانہ عقیدوں پر ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ پچھلے لوگوں کو اپنے پتھر کے خدا توڑنے پڑے تھے، تب ہی وہ ''واحد و لاشریک'' پر ایمان لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جھوٹے خداؤں کے دعوے داروں کو توڑا تو ''سچا خدا'' پایا حدی! کیا انسان گھاٹے میں رہا؟ ایمان پایا تو باقی کیا بچا۔ تو ٹوٹنے سے کبھی نہ ڈرو، تبدیلی سے خوفزدہ نہ ہو۔

تم سیپی میں بند ہو، اور وہ تمہیں توڑ کر ''موتی'' بنا دینا چاہتا ہے۔

ہر دل جو تکلیف سہتا ہے، وہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ سوچو، عبادت میں افضل عبادت روزہ رکھنا ہے۔ تو کیا تم یہ کہو گی کہ اللہ بھوکا رکھوا کر ثواب کا لالچ دے رہا ہے۔ وہ تمہیں ویسے ہی ثواب کیوں نہیں دے دیتا؟ تم سے کھانا پینا چھڑوا کر خدا کیا کرنا چاہتا ہے؟

جسم کو بھوکا رکھوا کر، اللہ روح کو غذا دلواتا ہے۔ ایک کی بھوک، پیاس، صبر، برداشت، دوسرے کی روحانی طاقت ہے۔ تم جیسی ماڈرن لڑکی کو میں یہ بھی بتا دوں کہ آج تک دنیا میں، سائنس یا ترقی کے نام پر جتنے بھی معجزے ہوئے ہیں، وہ ''روحانی طاقت'' سے ہوئے ہیں۔ جسمانی طاقت سے کبھی کچھ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ سائنس دان کئی کئی دن کھائے پیے بغیر اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ تو کیا ان کے جسم انہیں معجزوں کی طاقت دیتے ہیں؟ کیا چاند پر جانے والا انسان طاقت ور تھا؟ نہیں حدی! اس کی جسمانی طاقت محدود تھی لیکن روحانی جرات لامحدود تھی۔ یہ روحانی طاقت ہی ہے جو ہر شے کو مسخر کرتی ہے اور کرنے والی ہے۔

اس لیے تمہیں تیس دن تک روزے رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تاکہ آئندہ کے گیارہ مہینے تم روحانی طاقت کے بل بوتے پر، اپنی مشکلوں اور مصیبتوں سے فائٹ کر سکو۔ یہ روزے انرجی اسٹور کر لیتے ہیں۔ وہ انرجی، جو دنیا کی کوئی خوارک، ٹانک، انرجی بوسٹر، لاکھوں کروڑوں کے نسخے بھی نہیں دے سکتے۔ یہ انرجی صرف اور صرف بھوکا رہ کر، روزہ دار بن کر ہی ملے گی۔ اگر بیرونی دنیا نے یہ انرجی کسی نہ کسی طرح سے پیدا کر بھی لی تو وہ اس انرجی کو تمہاری روح تک ڈیلیور نہیں کر سکے گی...... یہ کام صرف اور صرف اللہ کرتا ہے۔ صرف اس کا نظام سرانجام دیتا ہے۔

کیا تم کسی کو پیسے دے کر اپنی مصیبت سے لڑنے کے لیے کہہ سکتی ہو؟ کیا تم اپنی تکلیف، حتیٰ کہ اپنا سر درد کسی کو کھربوں ڈالرز دے کر سہنے کے لیے کہہ سکتی ہو؟ بیمار کا بستر ایسا بستر ہے جہاں بیمار کو ہی لیٹنا پڑتا ہے۔ تمہیں اپنے درد خود سہنے ہیں۔ اس لیے طاقت ذخیرہ کرنے

Sumaira Hameed:Author

کے لیے بھی تمہیں ہی کہا گیا ہے۔

دنیا میں اموات کی تیسری بڑی وجہ، ذہنی امراض، ڈپریشن، بے چینی، مایوسی ہے...... جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ ہمارے پاس ان سب بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہتھیار ہیں نہ طاقت...... ذہن میں جنگیں برپا ہیں اور انسان یہ جنگیں ہارتا جا رہا ہے، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو رہا ہے...... کیونکہ وہ سب سے بڑی طاقت ''روحانی طاقت'' کو بیدار کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ روحانی طاقت صرف روزے سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ سب سے آسان طریقہ ہے اسے حاصل کرنے کا۔

تمہاری کھانے پینے کی طلب کو تو ذکر اللہ تمہیں اتنی بڑی طاقت دے رہا ہے، تم اپنے رب کے معاملات میں شک کیسے کر سکتی ہو۔ وہ بیماری ہو یا کوئی اور تکلیف۔ تم اس پر سوال کیسے اٹھا سکتی ہو؟؟

''کتنے باعلم اور باخبر ہو تم......'' وہ اس کی ذہانت پر حیران تھی۔

''میں نہیں ھدیٰ! تم...... سارا علم، سب خبریں تمہیں دی گئی ہیں...... انسان کو......''

''مجھ......؟؟ ھدیٰ کو؟'' اسے اپنی چوبیس سالہ زندگی یاد آئی۔ ''ایسی غفلت، ایسی جاہلیت''۔ وہ بڑبڑائی تھی۔ ''ھدیٰ! تم نے علم کی کوئی ایک بات نہیں سیکھی...... کیوں؟'' وہ خود سے ہی شکوہ کر رہی تھی۔ ''تم نے اپنے رب کو کسی ایک بھی خوبی سے نہیں پہچانا...... کس لیے؟'' وہ خود پر افسوس کر رہی تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

''عام طور پر موت کی دھمکی انسان کو اپنی زندگی سے زیادہ باخبر کر دیتی ہے۔'' (پاؤلو کوہلو)

'مجھے کینسر کا تحفہ دیا گیا کیونکہ اس کے ذریعے اللہ نے مجھے تبدیل ہونے کا موقعہ دیا۔'' (علی بنت)

اور اب وہ باخبر ہو چکی تھی...... اس لیے......

''میں اپنی بیماری کو قبول کرتی ہوں......'' مضبوط انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''روحانی طاقت اور زندگی کے لیے، اپنے رب کا مقصود پانے، خود کو پوری طرح سے، علم اور یقین کے حوالے کرنے کے لیے...... میں...... میں ھدیٰ! میں اپنی بیماری کو تکلیف نہیں، مصیبت نہیں، سزا نہیں، انعام کی صورت میں قبول کرتی ہوں۔''

فرشتے نے اسے خوشی سے دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے...... یہی میرا کام تھا، تمہیں سمجھانا، راستہ دکھانا۔''

''کیا میں ٹھیک ہو سکتی ہوں؟'' اس نے سب سے اہم سوال پوچھا تھا۔

''شک کرنا چھوڑ دو......'' اس نے سب سے 'اہم' جواب دیا تھا۔

''میں ٹھیک ہونا چاہتی ہوں...... شفایاب......''

''وقت کی مقدار، اور گنتی کو بھول جاؤ۔ اپنا حوصلہ پہاڑ بنا لو اور اپنی ہمت آسمان...... خدا سے تجارت شروع کر دو......''

تجارت؟؟'' فرشتہ اسے حیران کرتا رہا تھا لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی حیران کر دیا تھا کہ بے ساختہ اس کا منہ کھل گیا تھا۔

Sumaira Hameed:Author

''تمہاری زبان میں ''بزنس''...... انویسٹمنٹ شروع کر دو اللہ کے ساتھ۔ جو دے سکتی ہو، دے دو، پھر اس سے وہ مانگ لو جو اس سے لینا چاہتی ہو۔''

''کہنا عجیب لگ رہا ہے لیکن شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم مجھے اللہ کے ساتھ بزنس کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟''

''بالکل...... اللہ کو قرضہ حسنہ دو، اور اللہ معاملات میں بہترین ہے۔ اللہ کے ساتھ بزنس کرنے سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ سب انویسٹ کر دو، سب...... اس کا وعدہ ہے کہ اس کے ساتھ بزنس کرنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ ایسا بزنس ہزار گنا سے زیادہ منافع میں جاتا ہے۔ اور اللہ کے ہزار گنا کو اپنے حساب کتاب کے ہزار گنا میں نہ گننا۔ اللہ کی گنتی اور وزن کے پیمانے انسان کبھی نہیں بنا سکے گا۔''

وہ ابھی تک ہکا بکا تھی۔ اس نے بے یقینی سے اپنی تھوڑی بھی کھجائی تھی۔ اس نے مذہب کی اسٹڈی نہیں کی تھی، ساری دنیا، پوری مخلوق نے مل ملا کر لفظ ''مذہب'' کو اتنا زیادہ بدنام کر دیا ہے کہ اس کی اسٹڈی کرنا، جرم کرنے کے برابر لگتا ہے۔ ہر انسان مذہب سے ایسے دور بھاگ رہا ہے جیسے اس سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا چیز کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

''اچھا...... تو میں کیا انویسٹ کروں؟'' یقین اسے ابھی بھی نہیں آیا تھا لیکن پھر وہ بھی پوچھ رہی تھی۔

''کچھ بھی...... جو دے سکتی ہو، وہ دے دو، بدلے میں تمہیں اس کا منافع مل جائے گا۔''

''اچھا...... کیا میں بے چینی دے سکتی ہوں؟؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بالکل...... دے دو...... بدلے میں قرار مل جائے گا......''

''کیا واقعی...... میری بے چینی بھی انویسٹ ہو سکتی ہے؟''

''بالکل ہو سکتی ہے...... اپنی توجہ، اپنی محبت، اپنی شکر گزاری، اپنا صبر، اپنا درد، اپنی تکلیف، سب دے دو۔ اپنا سب کچھ انویسٹ کر دو۔ کسی چیز کو معمولی نہ سمجھو...... خدا ہر چیز میں ڈیل کرتا ہے۔ ہر چیز انویسٹ ہوتی ہے اس کے بزنس میں۔ دکھی دلوں کو دی جانے والی تسلی اور معصوم دلوں کو دی جانے والی مسکراہٹ تو خاص طور پر......''

''میری بے قراری...... میرا غصہ...... میرا بے صبرا پن بھی؟''

''یہ تو سب سے پہلے...... سب سے بڑی انویسٹمنٹ ہی ''منفی جذبوں'' کی ہوتی ہے۔ سب حسد، تمہارے لفظ بھی، تمہاری خاموشی بھی۔ تم اس کے لیے صبر کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے تکلیف کو قبول کر لو، تم اس کے لیے اس تکلیف سے نکلنے کا چارہ کرنا شروع کر دو۔ تم اس کے لیے مسکرا دو۔ تم اس کے لیے اپنی بے چینی کا گلا گھونٹ دو۔ تم اس کے لیے پرسکون ہو جاؤ، تم اس کے لیے ''صبر'' سے رہو۔ تم اس کے لیے بے صبری چھوڑ دو، تم اس کے لیے ہمت سے کام لو، تنہائی سے نکل آؤ۔ یہ سب تم اس کے لیے کرتی جاؤ...... اور پھر وہ تمہارے لیے سب کر دے گا......''

''کیا اللہ اتنا کچھ......'' سوال ادھورا رہ گیا تھا فرشتے نے ''کیا'' سے بات اچک لی تھی۔

''خدا کے اختیار پر کبھی ''کیا'' کا سوال نہیں اٹھاتے حدی۔ ''کیا'' بہت بڑا اعتراض ہے۔ کیا وہ میری مدد کرے گا، کیا وہ مجھے

Sumaira Hameed:Author

معاف کرے گا۔ کیا وہ مجھے سنتا ہے، کیا وہ...... کیا وہ...... اللہ ہمیشہ موجود رہا ہے، وہ کبھی ''کیا'' نہیں ہوتا۔ اس لفظ کو اپنے دل سے نکال دو...... خدا کی صفات پر ''کیا'' نہیں لگ سکتا۔ وہ تو کن کہتا ہے اور فیکون ہو جاتا ہے۔ کیا (سوال، شک) کو تو پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ کیا (شک) کو شیطان نے بنایا اور انسان کو تھما دیا۔''

حدی کو جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی تھی۔ ''کمال ہو گیا......'' وہ مسکرا رہی تھی۔ ''کتنی بے وقوف رہی ہوں میں۔''

''ہاں...... بہت بڑی فول......'' فرشتہ بر بار اسے اچھے الفاظ میں تسلی دینے والا نہیں تھا۔ طنز کرنا اس کا بھی حق بنتا تھا۔

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''ہاں فول...... فول......'' فول نے ماما کے لائے پھولوں میں سے ایک پھول نکال کر پکڑا لیا۔

''میری پہلی انویسٹمنٹ......'' اس نے کمرے سے باہر قدم بڑھا دیئے تھے۔

''یہ آپ کے حصے کا پھول اور خوشبو۔ مجھے خدا کے باغ میں آپ کے نام سے کھلا ہوا ملا، سوچا خدا کے جہاں میں کھلے ہوئے دوسرے پھول کو دے دوں...... آپ کو......''

وہ ساتھ والے کمرے میں آئی تھی، جہاں دو بچوں کی اٹھائیس سالہ ماں ایڈمٹ تھی۔ وہ بھی کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ اس نے ایسے محبت بھرے انداز سے کہا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی تھیں۔ ''پھول، پھول کو پھول دے رہا ہے۔'' پھول لیتے ہوئے ہنس کر کہا۔

شوہر نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں دونوں ایسے باتیں کرنے لگی تھیں جیسے ایک ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہوں اور بچیوں کی پونیاں بھی کھینچتی رہی ہوں۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو دونوں کے بلند بانگ قہقہوں سے دیواریں لرزنے لگی تھیں۔ یہ سب ایسے ہی جاری رہتا تو، ہاسپٹل کی چھت گرنے کا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ لڑکیاں جب مل بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں تو یقین جانیں زمین کے پھٹنے تک کا خطرہ موجود رہتا ہے......

انسان، کسی دوسرے انسان کو جو سب سے زیادہ قیمتی چیز دے سکتا ہے، وہ اس کا ''وقت'' ہے۔ اللہ کے پاس جو بہترین چیز انویسٹ کروا سکتا ہے، وہ دوسرے انسان کو دی جانے والی ''مسکراہٹ'' ہے...... انسانوں کو دیا جانے والا وقت، ان کے چہروں پر کھلائی جانے والی انویسٹمنٹ اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ دوسروں کی راہ سے چنے جانے والے کانٹے، خدا کو پھولوں سے زیادہ عزیز ہیں۔

اب وہ یہ پھول حاصل کرنے والی تھی...... کانٹے چن کر، اپنا لیے گلدستہ بنانے والی تھی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ امریکا کے بہترین ہاسپٹل میں علاج کروا رہی تھی۔ اس کے پاس دنیا کی کسی چیز کی کمی نہیں تھی، کمی تھی تو بس صحت کی۔ جو چیز وہ لاکھوں کروڑوں لگا کر بھی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ چیز لاکھوں کروڑوں کو مفت ملی ہوئی تھی۔ بات قدر کی ہوتی ہے...... کبھی وہ بھی ان لاکھوں کروڑوں لوگوں میں شمار ہوتی تھی...... تب وہ ناقدری تھی...... آج اسے قدر ہو گئی تھی......

اسے فکر رہی تھی تو اپنی بیوٹی، اسکن، بالوں ہیلز حتیٰ کہ پیروں کی ایڑیوں تک کی نہیں رہی تھی تو سب سے قیمتی شے زندگی کی نہیں رہی تھی...... اپنی زندگی کی...... دوسروں کی زندگی کی......

Sumaira Hameed:Author

زندگی سے زیادہ اہمیت تو اس نے چیتے کی کھال سے بنے جوتوں کو دے دی تھی ۔جن کی قیمت تک اسے یاد تھی نہیں یاد تھی تو اپنی ''زندگی کی قیمت''۔ چونکہ انسان زندگی کو خریدتا نہیں ہے اور دینے والا اسے بیچتا نہیں ہے تو وہ کبھی اس کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو پاتا ۔کل ملائکہ کا سجدہ، اشرف ہونے کا شرف، کائنات کی ہر شے کو تسخیر کرنے کا علم ،بندگی کا رتبہ، انسانیت کی معراج، دنیا میں امن کا تاج ترقی کا عندیہ، اپنی پہچان کا ہنر...... یہ ہے اس کی اہمیت ۔اور اتنی قیمتی زندگی کو یہ انسان گھٹیا سی چیزوں کے لیے نظر انداز کر دیتا ہے۔

''مجھے پیسے چاہییں پاپا!'' وہ دو دن سے گھر آئی ہوئی تھی۔ یونانی طرز کا تازہ پھولوں سے بنایا تاج سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ان پھولوں کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ وہ یونانی دیوی تو نہیں تھی ،لیکن اسے خوش کرنے کے لیے مان لیتے ہیں کہ وہ یونانی دیوی ہی لگ رہی تھی۔ گھر کے لان میں ہی چھوٹی سی پکنک کر رہی تھی۔ پاپا اس کے لیے سیب کاٹ رہے تھے۔ اور وہ باسکٹ میں سے باقی کی چیزیں نکال نکال کر پکنک شیٹ پر سجا رہی تھی۔ ابھی وہ چولہا بھی سیٹ کرے گی اور اس پر کچھ پکانے کی کوشش بھی کرے گی۔ کھائے گی پھر وہ اکیلی ہی۔

''کتنے......؟'' اس نے آج تک پیسے مانگ کر نہیں لیے تھے۔ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس کا اپنا پرسنل اکاؤنٹ تھا، ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے۔ پاپا کے سب وی وی آئی پی کارڈز بھی اس کی دسترس میں رہتے تھے۔

''جتنے آپ دے سکیں۔'' ان دنوں اس کے پاس جو سب سے خوب صورت چیز رہا کرتی ہے، وہ اس کی بے ساختہ مسکراہٹ ہے۔

پاپا اسے ناسمجھی سے دیکھ رہے تھے۔ ''جتنے تم لینا چاہو، میں اتنے دے سکتا ہوں'' سیب کی قاش اس کے منہ میں ڈالی۔

''میں سب لینا چاہتی ہوں۔ بھاری انویسٹمنٹ کر رہی ہوں میں ...... بہت بڑی والی ڈیل......'' ہاتھ پھیلا کر بتایا۔''بہت بڑی مطلب، بہت ت ت ہی بڑی......''

وہ ہنس دیے......اچھا......کیسی ڈیل اور کس کے ساتھ......یعنی یہ بڑی والی ڈیل؟''

''اللہ کے ساتھ......اپنا بزنس اسٹارٹ کر رہی ہوں......''

''تمہاری زندگی کے لیے میں اب تک بہت کچھ چیریٹی کر چکا ہوں۔ اور بھی دے سکتا ہوں میری جان۔''

''میں جانتی ہوں پاپا! ہم تینوں نے کبھی چیریٹی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ لیکن پاپا! شاید وہ سب بھی ہم نے فیشن کی طرح کیا۔ دیا لیکن ایفرڈ نہیں کیا۔ سخاوت یہ نہیں کہ ''کچھ'' دیا جائے۔ سخاوت یہ ہے کہ ''بہت کچھ'' کیا جائے۔ ہم نے وہ دیا جسے دینے سے ہماری دولت پر فرق نہیں پڑا۔ جیسے سوڈالرز میں سے ایک پینی دے دینا۔ اپنا، پیٹ، نیت، نفس سب اچھی طرح سے بھرنے کے بعد دینا۔ ہم اتنا کچھ جمع کر لیتے ہیں کہ باقی کی دنیا کو محروم کر دیتے ہیں۔''

''امیر ہونا گناہ نہیں ہے......''

''لیکن امیر ہو کر غافل ہونا گناہ کبیرہ ہے۔ کچھ کو کچھ پر اسی لیے برتری دی جاتی ہے کہ وہ دنیا کو بدلنے کے لیے آگے بڑھیں۔ لیکن ہم تو اپنے گھر، اپنے رنگ، اپنے بال، اپنی کھال بدلنے میں لگے رہتے ہیں۔''

''دنیا کو بدلنے میں، میں کبھی پیچھے نہیں رہا صدی!''

Sumaira Hameed:Author

''ہاں.....لیکن تب جب آپ کو اپنی مصروفیت سے وقت ملا۔ سال میں دو بار، ورنہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ بار۔ آپ نے اسے اپنا مقصد نہیں بنایا۔ آپ کا کروڑوں کا بزنس، پراپرٹی، مجھے نہیں بچا سکی..... دیکھیں ان سب چیزوں کی قیمت کتنی معمولی ہے۔ کیا ہم ان معمولی چیزوں کو دوسروں کے لیے غیر معمولی بنا سکتے ہیں؟ جو چیزیں مجھے کچھ نہیں دے سکیں، وہ دوسروں کو بہت کچھ دے سکیں گی۔ آسانیاں.....مسکراہٹیں.....راحتیں.....سب سے بڑھ کر ''شفاء''۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم.....''

☆ ...... ☆ ...... ☆

اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی این جی او سے بات ہو چکی تھی۔ وہ انہیں فنڈز اکٹھے کر کے دینے والی تھی اور وہ کانگو، افریقہ میں ہاسپٹل بنانے والے تھے۔ چیریٹی کی ابتداء اس نے خود سے کی تھی۔

وہ اپنے ڈریسنگ روم میں آئی تھی۔ آخری بار وہ یہاں تب آئی تھی جب اسے کانوکیشن کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس کی یہ واک ان کلوزٹ تھی، اس گھر کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ اسے پروفیشنل کی ٹیم نے آ کر ویسے ہی سیٹ کیا تھا، جیسے بڑے بڑے برانڈز کے اسٹور سیٹ کیے جاتے ہیں۔ ہر چیز ''شوکیس'' تھی۔ فیشن کی دنیا کی کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں تھی جو یہاں موجود نہیں تھی۔ اگر وہ ایک ایک چیز کو گننے اور اس کی خوبیاں گنوانے بیٹھتی تو ایک چھوٹی سی ڈکشنری تیار ہو سکتی تھی۔ یہاں موجود سب سے معمولی چیز اس کے فرلیپرز تھے جنہیں پہن کر وہ ڈریسنگ روم میں چلا پھرا کرتی تھی۔ اور ان کی قیمت صرف دو ہزار پچاس ڈالر (تین لاکھ) تھی۔

روم کے درمیان میں کھڑی ہو کر وہ گردن گھما کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ ہر طرف برانڈز ہی برانڈز تھے۔ تاریخی، نایاب جیول، نیلامیوں میں خریدے گئے کچھ خاص بیگز، نیکلس، جانوروں کی کھالوں سے بنے جوتے، ہاتھ کی کارگری کے کچھ نایاب نمونے..... ہر طرف نمائش تھی..... ہر طرف پیسہ تھا..... سفید سونے، ہر رنگ کے ہیرے موتی کے پہاڑ تھے۔ لاکھوں ڈالرز سے بنا روم، کروڑوں کی مالیت کی ''چیزوں'' کے لیے۔ یہ سب چیزیں..... یہ اس کے کسی کام نہیں آئی تھیں۔ وہ ہاسپٹل میں اکیلی جنگ لڑ رہی تھی۔

''سادگی ایمان میں سے ہے۔'' (حدیث)

انسان کو سونے کے پہاڑوں میں دفن ہونے کے لیے، ہیرے موتی کو اوڑھنے بچھونے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ چیزیں بس پتھر ہیں۔ لباس، وہ کتنا بھی مہنگا ہو، بس جسم کا پردہ اور آرام ہے۔ اس سے زیادہ اسے کچھ اور سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اس سے زیادہ اس پر خرچ کرنا، اس سے بڑی بے وقوفی ہے۔ خوراک..... بس پیٹ بھرنا، بھوک ختم کرنا..... بس..... کتنا کھاؤ گے، اور کیا کیا کھا جاؤ گے؟

نہ دولت فخر ہے..... نہ غربت لعنت.....

''زندگی کا ہدف، جسم، لباس، یا خوراک نہیں ہے۔'' (حضرت عیسیٰ)

اگر چیزیں انسان کو خوشی دے سکتی ہیں تو، وہ بس ایک ہی صورت میں کہ ان کے ساتھ زندہ نہ رہا جائے۔ انہیں جز سمجھا جائے ''کل'' نہیں۔ ان کے پہاڑ نہ اکٹھے کیے جائیں، انسانیت کی فلاح کی طرف ان کے دریا بہا دیے جائیں۔ بھلا دنیا بھوک سے مرتی

Sumaira Hameed:Author

ہو، اور ساری انسانیت بیٹھی، نایاب گلابی ہیرے کے لیے بڑی بڑی بولیاں لگا رہی ہو...... ہیرا...... انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں کون ''کوہ نور'' ہوگا؟؟؟

اس نے سب سے پہلے اپنی سب سے پیاری چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ گلابی ہیروں کا نیکلس...... پاپا نے بڑی بولی دے کر اس کی اٹھارویں سالگرہ کے لیے یہ گفٹ لیا تھا۔ اپنی خوبصورتی، نایابی، اور بڑی 'بولی'' کی وجہ سے یہ نیکلس اس کے دل کے بہت قریب تھا۔ مرر کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے نیکلس کو گلے کے ساتھ لگایا تھا۔ اب وہ اسے پتھر کے چند ٹکڑے لگے تھے...... جو سب سے قیمتی چیز مرر میں دکھائی دے رہی تھی، وہ، وہ خود تھی......

''میں نے اپنی قیمتی گاڑیوں، گھڑیوں سے چھٹکارا پایا، برانڈڈ کپڑوں سے بھی۔ میں نے سب کچھ چیریٹی کر دیا۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔'' (علی بنت)

انسٹا پر اس نے نیلامی کا آغاز کر دیا تھا۔ سب سے پہلے گلابی ہیرے ہی نیلامی کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ اس کے اس قیمتی اور نایاب نیکلس کی نیلامی کی خبر اس کی کینسر کی خبر سے زیادہ وائرل ہوئی تھی۔ دنیا اسے خریدنے کے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ دنیا کو پاگل ہی ہونا ہے۔ کبھی وہ بھی اس پاگل دنیا میں شمار ہوتی تھی۔ ایک مشہور پاپ سنگر کی جیکٹ لینے کے لیے اس نے نیلامی کی بولی کی ساری حدیں پار کر لی تھیں۔ اس وقت وہ انیس سال کی تھی۔ اسی سنگر سے صرف تین منٹ کی ایک ملاقات کے لیے پاپا نے پورے پچاس ہزار ڈالر پے کیے تھے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔ اب وہ سنگر جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی میں مر رہی ہے۔ اس کی جیکٹ وارڈروب میں کسی ٹرافی کی طرح لٹک رہی تھی، وہ نہ اسے سانس دے رہی تھی، نہ دوا...... پھر؟ پھر؟

عمارتیں...... چیزیں...... اور پتھر...... انسان نے اپنا قبرستان خود تیار کر لیا ہے اور وہ جانتا بھی نہیں ہے۔

ایک ایک کر کے وہ اپنی ساری چیزیں آن لائن سیل کر رہی تھی۔ اس سیل کو این جی او کی ٹیم ہی ہینڈل کر رہی تھی۔ وہ مشہور تھی، اس کی چیزیں بھی عام نہیں تھیں، اس لیے قیمت اچھی مل رہی تھی۔ اس نے انٹرویو کے لیے رابطہ کرنے والوں کو بھی رسپانس دینا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ شو پیس بننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن تھوڑا بہت ایڈجسٹ کر رہی تھی۔ وہ فنڈز کے لیے ایکٹیو ہو چکی تھی۔ یہ وہی سوشل میڈیا تھا جس پر اس نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت، برباد کیا تھا۔ اب بھی یہ وہی سوشل میڈیا تھا، جو زندگیوں کو بچانے کے لیے فنڈز جمع کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔

صراط مستقیم (درست سمت) ہر شے کے معنی بدل دیتی ہے......

اسے یہ سب کام کرتے ہوئے پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ ڈاکٹرز کا بتایا 'موت کا وقت'' کب کا گزر کر جا چکا تھا۔ وہ زندہ تھی، پوری طرح سے ایکٹیو تھی۔ اب وہ گاہے بگاہے ہاسپٹل سے نکل آتی تھی۔ ہفتے دس دن میں کسی نہ کسی ایونٹ میں چلی جاتی تھی۔ وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ ڈاکٹرز کا بتایا وقت آ کر جا چکا ہے۔ ماما، پاپا اس کی صحت سے خوش تھے۔ اس کے گالوں پر لالی پڑنے لگی تھی۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جس چیز کے ذائقے کا کبھی مزا نہیں چکھا تھا، اس ذائقے سے اب لطف اندوز ہو رہی تھی...... زندگی کے ذائقہ سے......

Sumaira Hameed:Author

تین تین گھنٹے وہ سیلون میں گزار دیا کرتی تھی۔اب انہی تین، چار گھنٹوں میں، وہ تین چار میٹنگز اٹینڈ کر لیتی تھی۔اسے کہیں نہ کہیں فنڈ ریزنگ کے لیے جانا پڑتا تھا، وہ وہاں چلی جاتی تھی۔اسے مختلف سوشل میڈیا ایوارڈ شوز میں اے لسٹر کی حیثیت سے بلایا جاتا تھا۔کچھ بڑے چینلز بھی اسے اپنی ایوارڈ تقریبات میں بلاتے تھے۔وہ اپئیرنس چارج نہیں کرتی تھی، فنڈز کی ڈیمانڈ کرتی تھی۔جو ڈریس پہنتی تھی، جو بیگ پکڑتی تھی، کانوں میں پڑے ایئر رنگز تک پر اسے فنڈز مل رہے تھے...... اس نے سب ریورس کر دیا تھا...... یہ وہی چیزیں تھیں جنہیں پہن کر وہ پیسہ برباد کرتی تھی، اب یہی وہ چیزیں تھیں جن سے وہ فنڈز وصول کر رہی تھی...... نیت کی تبدیلی سے، چیزیں وہی رہتی ہیں لیکن ان کے فائدے بدل جاتے ہیں۔

انسانیت کی خدمت، فلاح کے لیے جو امداد جمع کی جاتی ہے، وہ کوشش سے نہیں، نیت سے جمع ہوتی ہے۔لوگ اس گمان میں رہتے ہیں کہ فلاں ہاسپٹل یا ٹرسٹ چندے سے بنا...... نہیں...... بندہ نیت کرتا ہے، اللہ تکمیل کرتا ہے...... بس ایک سچی نیت اور کوشش چاہیے۔

''آپ ایدھی جیسا اتنا بڑا ٹرسٹ کیسے چلا رہے ہیں۔اتنے زیادہ فنڈز کون دیتا ہے؟''

''زمین والوں کے لیے...... آسمان والا دیتا ہے......'' (ایدھی)

☆ ...... ☆ ...... ☆

''زمین والوں کے لیے آسمان والے کا رحم کبھی کم نہیں پڑتا۔ہم نے یہ یقین کیسے کھو دیا؟؟'' وہ پیسا پوچھ رہی تھی۔

سب چپ چاپ اسے سن رہے تھے۔اس کی آواز کا جوش انہیں، خوشی دے رہا تھا۔

''ہم نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ہم نے کیسے مان لیا کہ اللہ کو ہم سے نفرت ہے؟''

''اس لیے کہ ہم کوڑھی ہو چکے ہیں۔یہ بیماری ہے اس کی ناراضی کا ثبوت......'' کسی نے کہا۔

''بس؟ صرف اس لیے کہ ہمیں کوڑھ ہو گیا؟ صرف اس لیے کہ ہم بیمار ہو چکے ہیں۔ہماری کھال جھڑنے لگی؟ تندرستی کے ساتھ بیماری ہے، جیسے زندگی کے ساتھ موت ہے۔جس نے ایک کو بنایا، اس نے، اس کا جوڑ بھی بنایا۔تو کیا ہم اس لیے دھتکاریں جائیں گے کہ ہم پر اللہ کا حکم پورا ہوا ہے؟ زندگی پر موت آتی ہے تو کیا وہ خدا کے حکم کی تکمیل نہیں ہوتی؟''

''خدا کے حکم کی تکمیل ہی ہوئی ہے...... ہمارے گناہ پر خدا کی سزا کی صورت میں۔''

''گناہ......؟؟ کون سا گناہ؟؟''

''کوئی ایسا گناہ جس نے خدا کے قہر کو دعوت دی تھی۔سزا میں اس نے ہمیں یہ بیماری دے دی ہے۔''

''تو کیا روئے زمین پر ہم اکیلے ہیں جو گناہ گار ہیں؟ کیا ہم سے پہلے کوئی گناہ گار نہیں ہوا؟''

وہ دنگ رہ گئے...... چپ ہو گئے...... لاجواب ہو گئے...... عجیب سوال تھا......

''میں مان لیتی ہوں ہمیں ہمارے کسی گناہ کی وجہ سے کوڑھ ہوا، پھر ان دو بچوں کو کیوں ہوا، جنہیں پانچ سال پہلے یہ بیماری ہوئی تھی؟ بچوں نے کیا گناہ کیا ہو گا؟؟''

Sumaira Hameed:Author

''ان کے ماں باپ کے گناہ.....شاید ان کی سزا.....''ان کی آوازیں کمزور پڑنے لگی تھیں، کیونکہ ان کی دلیلیں کمزور تھیں۔

''خدا کا خوف کرو، اپنے خدا کے بارے میں ایسے گمان نہ کرو۔کیا وہ معصوم روحوں کو، ایسے گناہ کی سزا دے سکتا ہے جو انہوں نے کیا ہی نہ ہو۔ ہمارے کمزور عقیدوں نے ہمیں بھٹکا دیا ہے۔ہم نے اپنے رب کو غلط گمان سے پہچانا ہے۔ہاں مجھے کوڑھ ہوا، میں بیمار ہوئی۔لیکن یہ کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کا عذاب، خدا کی لعنت نہیں ہو سکتی۔''اس کی آواز خوشی کے احساس سے منور تھی۔

''تم خوش گمان ہو رہی ہو دبیسا! سب نشانیاں ہم پر لعنت کی ہیں۔دیکھو ہماری شکلیں، ہمارے زخم، ہمارے جسم، مجھے تو خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے تو کیا خدا کو نہیں ہوتی ہو گی۔ میں اپنا عکس پانی میں نہیں دیکھ سکتا، اتنا کریہہ صورت ہو چکا ہوں۔''

''تو کیا خدا خوبصورتیوں کا خدا ہے؟؟؟وہ پھول کا خدا ہے لیکن کانٹے کا نہیں؟؟''سب کو سکتہ ہو گیا تھا۔''جواب دو مجھے؟؟''

ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، ان کے پاس بس ناسور تھے، بدنصیبی تھی، تڑپ اور تنہائی تھی۔

''ہم اس غلاظت کے ڈھیر پر خدا کی وجہ سے نہیں، اس زمین کے انسانوں کی وجہ سے رہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا، ہم بیمار ہیں، اور اس وقت خدا کے رحم کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔''اس نے دو ٹوک کہا تھا، کامل یقین سے کہا تھا۔

''کیا رحم ایسے ہوتا ہے؟''ایک نے اپنا جسم کے زخم کے اس کے سامنے کر دیے تھے۔

''ہاں! یہ بھی رحم ہی ہے۔ہمیں اس کے معاملات پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا رب ہماری طرف سب سے زیادہ متوجہ ہے۔ہمیں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے۔''

''ہمیں ایسی امید نہ دو دبیسا! ہمارا سینہ چھلنی نہ کرو۔''ضعیفہ بھی تڑپ اٹھی تھی۔

''ایک ماں کے چار بچے ہیں۔ایک بچہ کھیل رہا ہے۔ایک بچہ سو رہا ہے۔ایک اس کی گود میں ہے اور ایک بخار سے تڑپ رہا ہے۔ ہائے، ہائے کر رہا ہے۔ماں کا دل کس بچے کی طرف کھینچے گا؟''وہ ایک ایک کی طرف گھوم کر پوچھ رہی تھی۔

''جو بخار میں ہے.....''ضعیفہ نے بے ساختہ کہا تھا۔یہ تو سامنے کی ہی بات تھی۔

''ہاں.....اس ماں کا دل اس بچے کی طرف کھینچے گا جو تکلیف میں ہے۔وہ اسی کی طرف زیادہ متوجہ ہو گی جسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہو گی۔ جو روتا، تڑپتا، بلبلاتا ہو گا۔یہ ایک ماں کی محبت ہے.....اس کے بارے میں سوچو جس نے ماں کے دل پر ایسی محبت اتاری ہے.....وہ کون ہے جو ایسی محبت کا خالق ہے.....؟؟کون ہے؟؟وہ ہمارا رب ہے.....

ہمارے رب نے ہمیں نہیں چھوڑا تھا، ہم نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ہم نے اسے پکارا ہی نہیں تھا۔ہم دنیا والوں کے گمان کے ساتھ چلے، ہم نے اپنا ایمان کھو دیا۔ہم نے مان لیا کہ ہم لعنتی ہیں، گناہ گار اور بدبخت ہیں۔اگر ہم یہ سب ہیں تب بھی خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا تھا۔وہ سب کی سنتا ہے لیکن ہماری زیادہ سنتا ہے کیونکہ ہم تنہا ہیں، تکلیف میں ہیں، ہم بیمار ہیں۔وہ سب کے پاس ہے لیکن ہمارے پاس زیادہ ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔وہ سب پر رحم کرتا ہے، لیکن ہمیں وہ اپنے رحم کے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔کیونکہ ہم دنیا کی بے رحمی کا سب سے زیادہ شکار ہوئے ہیں۔''کہتے کہتے دبیسا رو دی تھی۔

Sumaira Hameed:Author

گھاٹیوں میں سناٹا چھا گیا تھا...... بس دبیسا کا پرندہ دھرا تھا، جس کے پر پھڑ پھڑا رہے تھے......

''تمہارا ایمان کیا کہتا ہے...... جواب دو......'' ایک ایک کو دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

ضعیفہ کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ ''کہ اس نے مجھ سے میرا رزق نہیں چھینا۔ کوڑھی ہونے پر بھی مجھے ہر روز کھانے کے لیے ملتا رہا۔'' وہ سسکنے لگی تھی۔

''اور تمہارا......؟'' اس نے دوسرے بیمار کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا یقین کیا کہتا ہے؟''

''مجھے اندھیرے اور تنہائی سے ڈر لگا کرتا تھا، جس دن میں پہلی بار یہاں آیا تھا، اس رات میرا دل خوف سے بند ہو جانے کو تھا۔ بھیڑیے مجھے کاٹ رہے تھے اور سانپ مجھے ڈستے تھے۔ رات اندھیری تھی۔ بادل چھائے تھے...... میں بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ کچھ وقت گزرا، بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ اس کی کرنیں، عین میرے تاریک بستر پر پڑ رہی تھیں۔ میرے اندھیروں کے لیے، ہمیشہ کہیں نہ کہیں سے چاند نکل آیا۔ میری روشنی کا انتظام اس نے ہمیشہ کیے رکھا۔''

دبیسا اپنی گیلی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ ''اور تم......؟'' وہ تیسرے سے پوچھ رہی تھی۔

وہ ان سب میں سب سے کم عمر تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا، وہاں تھوڑا سبزا اگا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا پودا دکھائی دیتا تھا، جس پر ایک چھوٹا سا پھول کھلا ہوا تھا۔

''جس رات میں یہ شکوہ کر کے سویا تھا کہ اس نے مجھے بدصورتی کا تحفہ دیا، اس رات کی صبح، اس پودے پر یہ پھول کھلا تھا۔ دنیا کا سب سے خوب صورت پھول۔ میرا یقین ہے کہ یہ پھول اس زمین کا نہیں، اس مقام کا ہے، جسے سب جنت کہتے ہیں۔''

سب گردنیں گھما کر اس پھول کو دیکھ رہے تھے...... پھول کی خوشبو سے سب کی روحیں معطر ہو رہی تھیں۔

''تو اب یقین کر لو کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہے۔ اس کی عبادت پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا اس بیماری سے پاک لوگوں کا۔ ہمارے جسم کوڑھی ہیں لیکن ہماری روحیں پاک ہیں......''

''تم کیا کرنا چاہتی ہو دبیسا؟ تمہاری باتوں پر یقین کر لینے پر بھی ہمارا نصیب نہیں بدلے گا۔''

''ہمیں نصیب نہیں بدلنا، ہمیں اپنے یقین کو ام الیقین کرنا ہے۔''

''ام الیقین......''

''یقین سے بڑھ کر یقین۔ نفرت کی سب نشانیاں ملنے کے باوجود، خدا کی ''محبت'' پر یقین۔ قہر کی سب علامتیں دکھائی دینے کے باوجود اس کے رحم پر ''یقین''۔ ہماری بیماری کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی، ساری دنیا کے کہنے کے باوجود ''اس کی شفا'' پر یقین۔ ''جو زمین پر نہیں ہوتا، وہ آسمان سے ہوتا ہے، صرف رب کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس شہادت پر ''یقین''۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

گھاٹیوں میں آگ لگی تھی اور وہ دور شہر میں، شہر والوں کو بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں کوڑھیوں کی پرواہ نہیں تھی لیکن پھر بھی انہیں

Sumaira Hameed:Author

ظالمانہ سی تشویش ضرور تھی ۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گھاٹیوں میں رہنے والے آگ جلا کر اس میں کود رہے ہیں ۔ آخر کار سب مر رہے ہیں؟ آگ میں جھلس کر خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنے میں ان کی مدد کس نے کی ہے؟

''دبیسا غلاظت جلا رہی ہے ۔ ناپاک لبادے، بستر، اور استعمال کی دوسری ناکارہ چیزیں ۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ عبادت کرنے جا رہی ہے ۔ اور عبادت کا آغاز غلاظت کی صفائی سے شروع ہوتا ہے ۔ وہ خدا کو پکارنے کا انتظام کر رہی ہے ۔'' ان تک خبر پہنچ چکی تھی ۔

''خدا..... وہ اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام کیسے لے سکتی ہے؟''

''زمین کی طرح تم نے خدا کو بھی اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے؟؟'' والد پوچھ رہے تھے ۔ شہر والوں نے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا ۔ جس دن دبیسا شہر سے ہو کر گئی تھی، اس دن وہ لوگ ان کے گھر میں انہیں ڈرانے دھمکانے پہنچ گئے تھے ۔ والد چپ چاپ سب سنتے رہے تھے ۔ لیکن ان کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا ۔ انہیں اپنی دبیسا پر فخر تھا ۔

''دیکھو اس دیوانے کو..... اولاد کے غم میں یہ خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی باز نہیں آ رہا ۔ او بد بخت کے باپ ۔ شکر ادا کرو کہ ہم نے تمہیں شہر سے نکال باہر نہیں کیا ۔ تم دونوں باپ بیٹی کی وجہ سے شہر پر کیسے کیسے عذاب نہیں آئے ۔''

''وہ تمہارے اعمال کا پھل ہوں گے ۔'' والد نے اطمینان سے کہا ۔

''اچھا ..... تو پھر تمہاری بیٹی نے کس عمل کا پھل کھایا ہے؟؟ بتاؤ، کس گناہ سے منہ کالا کیا تھا جو سارے جہان میں خدا نے اس کا منہ کالا کر دیا..... ذلت اور رسوائی تو بہت سوں کو نصیب ہوتی ہے پر جو کوڑھی کا نصیب بنتی ہے، اس کی تو مثال ہی نہیں ملتی ۔'' قہقہہ لگایا ۔

والد نے تڑپ کر کہنے والا کی گردن دبوچنی چاہی تھی ۔ لیکن دوسرے لوگوں نے زوردار دھکا دے کر گرا دیا تھا ۔

''جا کر کہہ دو اپنی لاڈلی سے، گناہ گاروں کی صف سے نکل کر ہم میں شامل نہ ہو ۔ اگر اس نے اپنی ناپاک زبان سے خدا کا نام لیا تو اس کی زبان کاٹ دوں گا.....''

وہ زیر لب خدا کو یاد کر رہی تھی ۔ آگ بھڑک رہی تھی ۔ دبیسا نے ایک ایک غلیظ چیز اٹھا کر آگ میں جھونک دی تھی ۔ وہ عبادت کے لیے اہتمام کر رہی تھی ۔ پھر اس نے ایک بلند گھاٹی کی صفائی کی تھی ۔ عبادت کے لیے اس نے بلندی کا انتخاب کیا تھا ۔ سمندر کے پانی سے اس جگہ کو اچھی طرح سے دھویا تھا ۔ گھاس پھونس کا فرش بچھا کر حنیفہ سے منگوائے کچھ پھول اس نے کنارے کنارے رکھ دیے تھے ۔

سورج غروب ہوتے ہی وہ سب آگے پیچھے مجلس کی صورت میں بیٹھ گئے تھے اور باری باری حمد و ثناء کرنے لگے ۔ صبح کی اولین کرنوں تک یہی کرتے رہے تھے ۔

''ہم خدا کو اس کے رحم سے پہچانتے ہیں ۔ ہم اس کے رحم پر یقین رکھتے ہیں ۔'' دبیسا نے عبادت کو اس تعریف پر ختم کیا تھا ۔

اب ہر رات وہ اسی جگہ، اسی طرح بیٹھ کر حمد و ثناء کرنے لگے تھے ۔ پہلی رات سے اگلی رات تک، وہ خدا کو پہلے سے بہتر جاننے لگے تھے ۔ ہر رات کی صبح ان کا شک یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ تو صرف بیمار تھے..... صرف بیمار..... انہوں نے اس کے علاوہ خود کو کچھ اور کیوں سمجھا ۔ وہ سمجھتے نہیں تھے ۔ رات بھر خوش و خرم رہتے تھے ۔ کسی چیز نے انہیں اتنا خوش نہیں کیا تھا جتنا خدا کی حمد کرتی تھی ۔ کسی چیز نے

Sumaira Hameed:Author

انہیں اتنا مطمئن نہیں کیا تھا جتنا اس یقین نے کہ وہ بد بخت نہیں ہیں۔

آہستہ آہستہ ان کی رات کی آوازیں، یک زبان ہو کر حمد کی کامل صورت میں ڈھل گئی، اور رات کے سناٹے میں گھاٹیوں میں گونجنے لگی تھیں۔ دور کھڑے والد بھی اپنی دبیسا کی آواز کے ساتھ آواز ملاتے رہتے تھے۔ ان کی بیٹی بلندی پر خدا کے حضور بیٹھی تھی، وہ نیچے ہاتھ جوڑ کر خدا کے حضور کھڑے تھے۔

اپنی ناپاک زبانوں سے کوڑھی خدا کی حمد وثناء کرتے ہیں۔ یہ بات شہر کے بر کلین کو سخت ناگوار گزری تھی۔ اور یہی بات گھاٹیوں کے کوڑھیوں کی شہرت کی وجہ تھی۔ بات مسافروں کے کانوں تک پہنچی تھی، مسافروں سے شہر سے باہر جا پہنچی تھی۔

''کوڑھیوں کے شہر میں ایک لڑکی، شفاء کی دعا کروا رہی ہے۔''

یہ بات دور دور تک پھیل گئی تھی۔ ایسے ہی جیسے کسی کو کوڑھ ہوتا تھا تو ہوا کے ساتھ اس کے کوڑھی کی خبر پھیل جاتی تھی۔ چھوٹے لوگ ہنس دیے تھے، بیمار لوگ اپنا رخ گھاٹیوں کی طرف پھیر چکے تھے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

''تمہاری بیٹی کی عقل کی داد دینی پڑے گی۔ ساری دنیا کو پاگل بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔ پاگل نہ ہوتی تو ساری دنیا کے کوڑھیوں کو جمع کر کے، خدا کی عبادت پر کیسے لگاتی۔ صحیح الدماغوں نے تو ان کوڑھیوں کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال دیا تھا۔ انہوں نے ان پر خدا کا نام لینا بھی حرام کر دیا تھا۔'' والد نے تحمل سے کہا تھا۔

''ہونہہ...... اپنی موت کے سامان کر رہی ہے......''

''زندگی کا اہتمام تو تم سب لوگ کر رہے ہو ناں...... تو پھر اس کی موت پر پریشان کیوں ہو؟''

''پاگل انسان...... بہک گیا ہے......''

وہ بالکل نہیں بہکی تھی...... ہر رات وہ سب کے ساتھ عبادت کرتی تھی۔ خدا کو پکارتی تھی۔ وہ سب ایسا کر رہے تھے۔ اسی لیے اب انہیں پتھروں، گالیوں کے ساتھ ساتھ خدا کو پکارنے کے طعنے بھی ملتے تھے۔

''تو کیا دیا خدا نے تمہیں؟ دوا؟ شفاء؟؟'' کوئی کسی کوڑھی کو روک لیتا۔ اس کا مذاق اڑانے لگتا تھا۔

''اپنا قرب دے تو دیا...... اور کیا چاہیے ہمیں......''

قہقہے۔ ''جس کے پاس خدا ہوتا ہے، اس کے پاس کوڑھ نہیں ہوتا۔''

''اصل کوڑھ تو تمہاری روحوں کو ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں سوچو۔''

''تمہاری شکلیں تو اور منحوس ہو گئی ہیں۔ کیا ملا عبادت کر کے......؟''

''کل کیا ہو گا وہ آج نہیں بتا تا......''

''جو کل ہو گا وہ آج مجھ سے سن لو۔ وہ تمہیں کوڑھ سے بڑی سزا دے گا۔ اپنی ناپاک زبانوں سے اس کا نام لینا بند کرو۔''

Sumaira Hameed:Author

''اگر وہ دے گا.....اگر وہی دے گا.....تو ہمیں سب قبول ہے.....سب.....''

کوڑھیوں نے کبھی ایسے دوٹوک جواب نہیں دیے تھے۔وہ ایسا جواب نہیں کیا کرتے تھے۔لیکن اب وہ جواب دینا سیکھ گئے تھے۔وہ خدا کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔وہ یہ بتانے لگے تھے کہ انسانوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے لیکن ان کا رب آج بھی ان کے ساتھ ہے۔

جب انسان حقیقت کا یقین پا لیتا ہے تو وہ بے یقینی کی کیفیت سے نکل آتا ہے۔انسان اور اس کی روح کو کوئی چیز اتنا فائدہ اور ایسی خوشی نہیں دے سکتی جتنا یقین دیتا ہے۔جب انسان یقین کھو دیتا ہے، تو دراصل وہ سب کچھ کھو دیتا ہے۔جس وقت انسان شک میں مبتلا ہونے لگتا ہے، اسی لمحے سب کچھ برباد کرنے لگتا ہے۔اللہ نے بندے سے صرف یہ ایک ''یقین'' مانگا ہے.....

کیونکہ یہی انسان کا سکھ ہے.....اور اسی میں اس کی فلاح.....

انہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی وہاں آ کر انہیں روک دے گا۔کوئی کوڑھیوں کے پاس چل کر آنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔گھاٹیاں تو ویسے ہی ''موت کی وادی'' کے نام سے مشہور تھی۔جن لوگوں نے انہیں شہر سے نکالا تھا، وہ جتنا بھی واویلا کرتے رہے تھے، شہر کے اندر تک کرتے تھے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔دن میں وہ لوگ وہی کرتے تھے، جواب تک کرتے آئے تھے لیکن رات ان کی اور ان کے رب کی تھی۔

''کتنا وقت گزر گیا دیبا! ہمارے لیے خدا نے کچھ نہیں کیا۔وہ ہمیں سن بھی رہا ہے یا نہیں۔''ایک بیمار نے پوچھا تھا۔

دیبا نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔''شک.....''اسے اگلی بات کرنے میں وقت لگا تھا۔''ایسا نہ کرو،رب پر سوال نہ اٹھاؤ۔''

وہ گڑبڑا گیا۔''کہیں لوگ سچ تو نہیں کہہ رہے.....ہم واقعی میں.....''

دیبا نے گہری سانس لی۔''ہم اس خدا پر ایمان لائے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتا، کیا وہ دکھائی دینے لگے گا تو جو اس پر ایمان نہیں لائے وہ ایمان لے آئیں گے؟''

''ہاں.....''اس نے فوراً کہا۔

''نہیں! وہ تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ایمان کا تعلق ثبوت سے نہیں ہوتا۔اس کا تعلق یقین سے ہوتا ہے۔روح اسی طرف کھنچتی ہے جس طرف سچائی ہوتی ہے۔کیا ہماری روحیں ہمارے رب کی طرف نہیں کھنچتیں؟؟؟''

''میرا خدا پر ایمان ہے لیکن.....''

''جو واقعی میں ایمان رکھتا ہے، وہ اس کی صفات، اس کے فیصلوں، اس کے وقت، اس کے معاملات پر بھی یقین رکھتا ہے۔''

ہر رات وہ الدو دیبا کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر حمد و ثنا کرنے سے نہیں تھکتے تھے۔دیبا بھی نہیں تھکی تھی۔وہ کوئی کام نہیں کر رہی تھی جو تھک جاتی۔کام تھکا دیتے ہیں، عمل نہیں تھکاتے۔جسمانی مشقتیں بھاری پڑی ہیں، روحانی مشقتیں ہلکا پھلکا کر دیتی ہیں۔وہ اپنے عمل میں کامل تھی۔وہ ہر رات خدا کو اسی طرح پکارتی تھی، جیسے پہلی بار پکارا تھا۔شک کو اس نے اپنے دل میں جگہ نہیں بنانے دی تھی۔

Sumaira Hameed:Author

ضعیفہ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔اس کی حالت ان میں سے سب زیادہ بری تھی۔وہ مایوس نہیں ہوئی تھی،لیکن وہ دکھی ہو چکی تھی۔

''میں دیکھنا چاہتی ہوں دبیسا!مرنے سے پہلے کہ میرے رب نے مجھے کیسے سرخرو کیا۔''وہ بڑبڑا رہی تھی۔

موت کا تو وہاں انتظار کیا جاتا تھا،لیکن اب یہ موت آسان نہیں رہی تھی،انہوں نے اپنی عرضی آسمان والے کے پاس بھیجی تھی۔ جواب میں انہیں اس کی مرضی جاننی تھی......آسمان والے کی رضا،اس کی چاہت،دیکھے بغیر وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔

''کیا آپ کو بھی شک ہے؟''وہ پوچھ رہی تھی۔

''نہیں......''وہ رو دی۔''اتنی ذلت دیکھی ہے کہ عزت دیکھنا چاہتی ہوں۔خدا کی محبت دیکھنا چاہتی ہو دبیسا!''

دبیسا نے ہتھیلی سے ضعیفہ کے آنسو پونچھیں۔

''آج رات،اس کی حمد کے بعد،ہم اس کی''چاہت''کی دعا کریں گے۔''

☆ ...... ☆ ...... ☆

''انسان کے حصے میں جو سب سے بڑی خوش نصیبی آئی ہے،وہ''اللہ کی چاہت''کی ہے۔''فرشتہ کہہ رہا تھا۔

اللہ کی چاہت......

لائم وغیرہ نے یونیورسٹی میں اس کے نام سے ٹرسٹ فنڈ قائم کر لیا تھا۔اسکول کے بچے اسے اسپورٹس ایونٹس پر بلا رہے تھے۔وہ اسے اپنے جیب خرچ سے فنڈز دے رہے تھے۔جو اسے دو ڈالرز دینے کے لیے بھی بلا رہا تھا،وہ وہاں بھی جا رہی تھی،جو اسے پانچ ڈالر دے رہا تھا،وہ اسے بھی کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ماما پاپا،فیملی فرینڈز،یونیورسٹی فیلوز،سب جتنا دے سکتے تھے،دے دیا تھا۔

سوشل میڈیا پر اسے سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا جا رہا تھا۔اس کی پچھلی زندگی کا ریکارڈ ایسا رہا تھا کہ اس فنڈ ریزنگ کو سب اس کا ڈرامہ قرار دے رہے تھے۔وہ بیمار نہیں ہے،سر کے بال صاف کروا کر بیماری کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔شہرت کے لیے لوگ گردنیں کٹوا دینے کے لیے تیار تھے،وہ تو پھر بیماری کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔

جو جتنا اچھا ہوتا ہے،اسے اس سے کہیں زیادہ برائی ضرور ملتی ہے۔یہ دنیا کا دستور ہے،روایت ہے،رواج ہے۔بس......یہ ہوگا،ہر حال میں ہوگا......وہ منہ توڑ جواب دینے والوں میں سے تھی لیکن اب اس نے خاموشی اپنائی تھی۔کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی زبان بھی انویسٹ کر چکی تھی۔کلام،اور بدکلامی بھی۔اسے دلیلیں نہیں دینی تھیں،بحث نہیں کرنی تھی۔وہ بہت تکلیف میں بھی ہوتی تھی تو ٹیم کو ہاں کہہ دیتی تھی۔کسی تقریب،ایونٹ یا انٹرویو کے دوران اس کا سر چکراتا تھا تب بھی وہ صبر کا مظاہرہ کرتی تھی۔اسے فنڈز دیے جا رہے تھے،وہ اٹھ کر چلی نہیں جانا چاہتی تھی۔کم ہمتی،کمزوری،بہانے،یہ سب بھی اس نے انویسٹ کر دیے تھے۔اسے وقت کی چھوٹ دی جاتی تھی لیکن وہ وقت کی پابندی کرنا مناسب سمجھتی تھی......

''تمہارے پاپا کہتے ہیں،میں نے ساری زندگی اتنا کام نہیں کیا جتنا اب تم کر رہی ہو۔''ماما حیران تھیں

Sumaira Hameed:Author

اسے فرشتے کی بات یاد آ گئی تھی۔ ''تم خود بھی نہیں جانتی کہ تم کیا کچھ کر سکتی ہو۔ تم نے خود کو کھوجا ہی نہیں تھا۔''

اب وہ خود کو تلاش رہی تھی...... دکھ اور سکھ کے ساتھ......

نیند کا دورانیہ مختصر ہو چکا تھا۔ وہ فارغ وقت میں کتاب کے لیے نوٹس ریکارڈ کرتی رہتی تھی۔ جہاں جاتی، جو کچھ کرتی، جس احساس اور کیفیت سے گزرتی، وہ پین کا بٹن پش کر کے ریکارڈ کر لیتی تھی۔ کار کی پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے دوران، رات کو سونے سے دس منٹ پہلے، صبح اٹھ کر بیس پچیس منٹ...... بہت تھا اتنا وقت...... وہی وقت جو موبائل چیٹ، پوسٹنگ، کمنٹنگ میں نکل جاتا تھا۔ وہی وقت جو فٹ مساج، فیس مساج، باڈی مساج، مینی، پیڈی کیور میں یوز ہوتا تھا۔

ہر دور میں انسان نے جھوٹے خدا بنائے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ وقت گزارتا ہے، انہیں پوجتا ہے، ان سے دل لگاتا ہے۔ ان کی ستائش کرتا ہے، ان سے طلب کرتا ہے۔ اس دور کے جھوٹے خداؤں میں سے چند کے نام فیس بک، انسٹا، ٹویٹر، کمنٹس، موبائل، فیشن، بیوٹی، ''دکھاوا'' ہے۔ انسان یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے کہ انہیں، اس نے ''خدا'' بنا لیا ہے۔ غفلت ایسی ہی بیماری ہوتی ہے، یہ حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتی، اور نقصان تک لے جاتی ہے۔

اس کے وائس نوٹس پیپر پر لکھے ہوئے اسے مل جاتے تھے۔ وہ انہیں ایڈیٹ کر لیتی تھی۔ اس کی زندگی کی کتاب کا ایک باب تیار ہو چکا تھا۔ اس پہلے باب میں اس کی بیماری سے پہلے کی زندگی کا احوال درج تھا...... چوبیس سال کی زندگی اور بس ایک باب...... کیونکہ اس میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں کہ وہ ''پوری کتاب'' بنتا۔ زندگی کا وہ حصہ جب وہ زندہ تو تھی لیکن ''ھدیٰ'' (درست سمت) نہیں تھی۔

''خدا کے ساتھ میری تجارت ٹھیک جا رہی ہے؟'' اس نے ایک دن فرشتے سے پوچھا۔

''ہاں...... اور اب تمہیں سب سے خاص چیز انویسٹ کرنی ہے......''

اچھا وہ کیا ہے......؟

''یقین...... ام الیقین......''

☆ ...... ☆ ...... ☆

زندگی ایک سفر ہے...... خدا کی پہچان کا سفر......

''انسان کمزور اتنا نہیں ہے، جتنا شاکی ہے۔ وہ ہارتا جلدی نہیں ہے جتنی جلدی ہارماننا شروع کر دیتا ہے۔ دنیا کی بدنصیبی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کو ہندسوں میں قید کر لیا ہے۔ ایک سال، دو گھنٹے، پانچ منٹ، بیس سیکنڈ۔ ہر چیز ٹک ٹک پر آ گئی ہے۔ اسی ٹک ٹک نے انسان کو بے صبرا بنا دیا ہے۔ مشکلوں، مصیبتوں، دعاؤں کی قبولیت، معجزوں کی رونمائی کو بھی سیکنڈز کا ہی الٹی میٹم دیا جاتا ہے۔

اس بیماری سے لڑتے ہوئے، اسے پورے اٹھارہ مہینے ہو چکے تھے۔ اکثر وہ خود بھی بھول جاتی تھی کہ وہ کبھی ہاسپٹل سے باہر بھی زندگی گزارتی رہی ہے۔ ماں رونے لگتی تھی۔ پاپا کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ لیکن پھر اس کی حالت سنبھل جاتی تھی، وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ موت کا آنا اٹل ہے، اس کا ہونا اٹل ہے۔ اگر زندگی کی مدت بڑھائی نہ جا سکتی تو اللہ درازی عمر کی دعا کرنے کے لیے کیوں کہتا؟

دعاؤں کی خیر اس کے ساتھ رہی تھی۔۔۔۔یقیناً۔۔۔۔وہ جانتی تھی کہ اسے کہا گیا تھا کہ وہ بمشکل سات آٹھ مہینے زندہ رہے گی اور وہ اٹھارہ مہینے زندہ رہ چکی تھی۔ لیکن اگر وہ ٹریٹمنٹ شروع نہ کرواتی، ہمت سے کام نہ لیتی تو آج کہانی مختلف ہوتی۔ ہم اپنی زندگیوں کی کہانیوں کے واقعات بدل سکتے ہیں۔ انسان کے اختیارات محدود ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کوشش کبھی محدود نہیں ہوتی۔ کس نے کہا بیمار ہمیشہ بیمار رہے گا؟ کون یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مصیبت زندہ کی مصیبتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی؟؟ انسان کے حوصلے بلند ہونے چاہیے، پہاڑ ہوں یا صحرا، سب ہیچ ہو جاتے ہیں اس کے سامنے۔۔۔۔۔

اس کی کتاب کے پانچ باب تیار ہو چکے تھے۔

''اسے اپنی زندگی میں ہی شائع کروا لو۔'' ایک بار اس کی فرینڈ کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ اداسی سے ہنس دی تھی۔ فرینڈ شرمندہ تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس میں اس کی فرینڈ کا نہیں اس اعتقاد کا قصور ہے جس نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی۔

کانگو میں ہاسپٹل کی بلڈنگ بھی تیار ہو رہی تھی۔ اسے وہاں بلایا جا رہا تھا لیکن وہ فی الحال ٹریول نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی سالگرہ آ رہی تھی اور اسے دعوت دی جا رہی تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ آ کر منائے۔ وہ چھبیس سال کی ہونے جا رہی تھی۔ لیکن اگر کوئی اس سے اس کی اصل عمر پوچھتا تو وہ کہتی ہے کہ ''دو سو سال، اور شاید کچھ مہینے۔'' دو سالوں میں اس نے دو سو سال کی زندگی جی لی تھی۔ زندگی مندرج کا نام نہیں ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا۔۔۔۔یہ منازل کا نام ہے شعور، آگاہی، زندہ دلی، روحانی بیداری۔۔۔۔اور اطمینان۔۔۔۔۔

زندگی ایسی کہانی ہے جو ہر روز کہی جاتی ہے اور مسلسل کہی جا رہی ہے۔ اپنی کہانی وہ کہتی رہی اور دوسروں کی سنتی رہی۔ اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملتی رہی۔ ٹرائی روم میں کپڑے ٹرائی کرتی رہی، لپ اسٹک کے شیڈز اور جوتوں کے اسٹائل بھی دیکھتی رہی۔ لیکن اب وہ پرائس پڑھتی تھی۔ اب وہ بھی ''افورڈ'' نہیں کر سکتی کہہ کر چیزیں سائیڈ پر کر دیتی تھی۔ وہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتی تھی، اسے اپنے کھانے سے بھی زیادہ فنڈز کی فکر رہتی تھی۔ وہ فضول خرچی سے ''فلاحی خرچ'' کی طرف آ گئی تھی۔ یہ اس کی روحانی ترقی، اور شعور کی آگاہی کی وجہ سے ہوا تھا۔۔۔۔۔

وہ روڈ ٹرپس پر اِدھر اُدھر وغیرہ کے ساتھ گئی تھی۔ دو کلاس فیلوز کی شادیاں بھی اٹینڈ کی تھیں۔ چھوٹے سے ایک ایکسیڈنٹ میں ایک فرینڈ کے دو عدد دانت داغ مفارقت دے گئے تھے، ان کا افسوس کرنے کے لیے بھی جانا پڑا تھا۔ چونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ دنیا کی بدصورت ترین لڑکی بن چکی ہے اور مصنوعی دانت بھی اس کی بدصورتی کم کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکے، تو وہ اسے اس کی خوبصورتی یاد دلانے گئی تھی۔ تین دن تک کمرا بند کر کے رونے کے بعد وہ ڈپریشن میں چلی گئی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ مصنوعی دانتوں کی مسکراہٹ بہت ''فیک'' لگتی ہے۔ ان میں وہ بات نہیں۔۔۔۔۔

بات بس اتنی سی ہے کہ ہم نے خود کو اتنا زیادہ پرفیکٹ بنا لیا ہے، کہ ذرا سا نقص ہماری نیندیں اڑا دیتا ہے، سکون تباہ کر دیتا ہے، ہمیں ڈپریشن کا مریض بنا دیتا ہے۔ پرفیکشن اور خوبصورتی کے بھوت نے اصل زندگی کا خون پیا اور گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔

Sumaira Hameed:Author

اس دوسو سالہ زندگی میں اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ زندگی اور موت ہمیشہ برابری کا سلوک کرتی ہیں۔ دنیا کا نظام کسی ''عام'' انسان کے مرنے پر نہیں رکتا تو ''خاص'' کے مرنے پر بھی چلتا رہتا ہے...... برابری......

سورج ہر روز اپنے وقت پر نکلتا رہتا ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ڈھلتی ہے، رات چھا جاتی ہے۔ چاند ستارے، ہوا، دھوپ، پانی، درخت، جنگل، پہاڑ، پرندے، بناتات...... ہر چیز اپنی ڈیوٹی دیتی رہتی ہے۔ کوئی ایک بھی، ایک دن کی چھٹی نہیں کرتا۔ یہ سب نشانیاں انسان کو یہ سبق دیتی ہیں کہ گھبراؤ نہیں۔ ہمارے ساتھ زندہ رہو۔ دیکھو ہم اپنے کام سے، اپنے مقصد سے ایک بھی دن کی چھٹی نہیں لیتے۔ ہم ہمیشہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، تم انسان ہو، تمہارے پاس سب سے خاص کام ہیں کرنے کے لیے، تم وہ کرتے رہو، زندگی کو غم کے سہارے نہ گزارو، زندگی کو زندگی بنا کر جیو۔ کتنا روؤ گے، کتنا دکھی ہو گے؟ کتنا یاد کرو گے؟ کتنا پچھتاؤ گے؟ رہنے دو...... آگے بڑھ جاؤ......

آگے بڑھ کر وہ ہر اس شے سے گلے مل چکی تھی جو 'زندگی' تھی۔

''تو تمہارے فرشتے کا کیا نام ہے؟''

وہ سب امر کے دادا کے گاؤں آئے تھے۔ کھانا کھا چکے تھے اور اب آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہ انہیں اپنے فرشتے کی کہانی سنا چکی تھی۔

''نام......؟؟ میں نے اس کا نام نہیں پوچھا۔ مجھے لگا کہ فرشتہ صرف فرشتہ ہی ہوتا ہے۔''

''جیسے انسان صرف انسان؟ ہر انسان کا ایک نام ہے تو فرشتوں کا کیوں نہیں؟'' امر اسے کم عقل ثابت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔

وہ ہنس دی۔ اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ 'اگر میں اسے نام دوں تو شاید ہدایت کا نام دوں......''

''یعنی گائیڈنس......؟''

''خاص اللہ کی طرف سے ملنے والی 'ہدایت''۔ یہ لفظ بہت گہرا ہے۔ گائیڈنس اس کا درست ترجمہ نہیں ہے۔ میں اس کے معنی نہیں سمجھا سکوں گی...... ابھی بہت کم عقل ہوں میں۔''

''شکر ہے تم نے اپنے فرشتہ کا نام کسی برانڈ سے متاثر ہو کر نہیں رکھ دیا۔''

پہلے وہ دھیمے سے ہنسی اور پھر قہقہہ لگا دیا۔ ''تم لوگ مجھے سات خون معاف کر دو گے لیکن میری فیشن ہسٹری معاف نہیں کرو گے؟''

''فیشن کوئی انسان ہوتا، تو اس وقت تمہارے پیچھے تلوار لے کر لگا ہوتا۔ تمہارا سر قلم کر کے ہی دم لیتا۔ کیسے کیسے تم نے اس بے چارے فیشن کی گردن نہیں مروڑی...... حال سے بے حال کر دیا۔ کسی جوگا نہیں چھوڑا اسے۔''

وہ ہنستی ہی رہی۔ آگ کا الاؤ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ تو آج کا رواج ہے کہ وی وی آئی پی لوگوں کو جان کی حفاظت کے لیے گارڈز رکھنے پڑتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان کے زمین پر آنے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ فرشتوں کو گارڈ کیا گیا ہے...... کتنی بڑی لگژری حاصل ہے ہر انسان کو...... اللہ کے لیے ہر انسان وی وی آئی پی ہے۔

Sumaira Hameed:Author

دو سال دو ہفتے گزر چکے ہیں......

ڈاکٹرز مایوس نہیں تھے لیکن...... رپورٹس، نتائج، جسم، ری ایکشن، ان کا کسی چیز پر بس نہیں تھا۔ اتنا کچھ جان کر بھی تو کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ ماما، پاپا دونوں انہونی کی سولی پر لٹکے رہتے تھے۔ جہاں وہ بدلی تھی تو پیچھے وہ بھی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے کوئی ایسی ترکیب نہیں چھوڑی تھی جو ان کی اولاد کی جان بچا سکتی۔ دنیا کے بازار میں ایک زندگی ہی تو نہیں بکتی۔ یہ اول بدل سے بھی نہیں ملتی، اور نہ ہی تلاش سے۔ یہ معجزہ صرف اوپر سے ہوتا ہے......

دو سال ایک مہینہ گزر چکا ہے......

''امید'' یہ ایک ہری بھری شاہراہ ہے......لیکن یہی امید جب ناامیدی میں بدلتی ہے تو تیز دھار تلوار میں بدل جاتی ہے، کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔ بیمار صرف بیماری ہی تو نہیں جھیلتا۔ اس کے ساتھ آنے والے ہزاروں خدشے، خوف، بدلتے انسانی رویے، بے بسی، ذہنی دباؤ بھی جھیلتا ہے...... ایک جسم سے، ایک دماغ سے، ایک روح سے...... وہ تین محاذوں پر اکیلا لڑ رہا ہوتا ہے۔

اس کے تینوں محاذ کمزور پڑنے لگے تھے...... حدی اوہ پھر سے رو دی تھی۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

وہ اس کا صرف کرش تھا......صرف ایک کرش......

چونکہ محبت کرنا جان جوکھم کا کام ہے، اور کرش ہر کوئی افورڈ کر سکتا ہے۔ اس لیے کچھ کرش زوہ بھی رکھتی تھی۔ ''اس پر میرا کرش ہے۔'' ٹرینڈ رہا ہے تو ظاہر ہے یہ ٹرینڈ اس نے بھی فالو کیا تھا۔ آٹھ دس بالی وڈ ہیروز پر، بیس بائیس پاپ سنگرز، دو چار ماڈلز، چند فٹ بالرز، کچھ آئی ٹی ٹائیکون اور...... اس پر...... جو اس کی فرینڈز سرکل میں سے تھا۔ جس کی شادی کی تصویریں وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ ایک بار وہ اس سے ملنے ہاسپٹل بھی آیا تھا۔ اگر وہ بیمار نہ ہو چکی ہوتی تو شاید...... لیکن اب......

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ یہ سوچ کہ ہر چیز، ہر شخص پر سے اس کا حق ختم ہو چکا ہے، اسے رلا رہی تھی۔ ساری دنیا اپنی اپنی پلاننگ پر چل رہی ہے، ایک اسی کی پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ہے، نے اسے پھر سے پرانی حدی بنا دیا تھا۔ وہ دن بھر روتی رہی، رات بھر جاگتی رہی۔ ایک ایک کر کے ہر چیز ہی اس سے چھن چکی ہے۔

''تو کیا جو چیزیں تم سے چھن گئیں، ان کے بدلے میں تمہیں انہیں سے بہتر چیزیں نہیں ملیں؟'' فرشتہ پوچھ رہا تھا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا اور رو بھی دی۔ ''کچھ باتوں کے جواب نہیں ہوتے ہدایت! وہ بس ہوتی ہیں۔ اداس کر دیتی ہیں۔ دل توڑ دیتی ہیں۔''

''تم پھر سے کمزور بن رہی ہو حدی! میں نے تمہیں اینٹ اینٹ پہاڑ بنایا ہے، اس دل شکستی کو خود کو دلدل نہ بنانے دو۔''

''تمہیں اپنی محنت کے ضائع چلے جانے کی فکر ہو گی......'' اس نے طنز کیا۔ اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد یہ رویہ اپنایا تھا۔

''میں تمہارا گارڈ ہوں...... مجھے تم سے زیادہ کون عزیز ہو گا؟ تم سے زیادہ کس کی فکر ہو گی؟''

Sumaira Hameed:Author

حدی نے گہرا سانس کھینچا۔''میں تنہا رہنا چاہتی ہوں...... میں ہر وقت تمہیں نہیں سن سکتی......'' اس نے چڑ کر کہا۔

''حدی! تم ٹھیک ہونے جا رہی ہو...... تھوڑی سی ہمت...... بس تھوڑی سی اور......''

پہلے تو وہ ٹہلتی رہی اور پھر ایک دم سے چلا اٹھی...... ''مجھے جھوٹی امید نہ دو...... بس کر دو...... دفع ہو جاؤ۔''

فرشتہ دنگ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔''تم نے میری کہیں سب باتیں بھلا دیں؟ تم نے مایوسی کی زبان سننی شروع کر دی؟''

وہ سر تھام کر بیٹھ چکی تھی۔''نہیں...... لیکن مجھے یہ مان لینے دو کہ میں اس بیماری سے نہیں نکل سکتی......''

''تم اس بیماری سے کیوں نہیں نکل سکتی؟ تم نے ایسا کیوں سوچا؟''

''کیونکہ اس کا علاج نہیں ہے...... مجھے دماغ کا کینسر ہے، میرا کیس اپنی نوعیت میں پیچیدہ ہے۔''

''شفا، سائنس کی زبان پڑھتی ہے نہ میڈیکل رپورٹس کی۔ وہ بس ملتی ہے۔ واقع ہوتی ہے۔ آسمان سے اترتی ہے۔ حکم پر عمل در آمد کرتی ہے۔'' اس نے ایک درد بھرا سانس کھینچا۔''میں نے تم سے کہا تھا یقین رکھو۔''

''میں نے یقین رکھا ہے......'' اس کی آواز تیز تھی۔''رکھا ہے، لیکن پھر بھی...... یہ بہلاوا لگتا ہے......''

''جب انسان یقین کھو دیتا ہے تو وہ سسٹم کو ریورس گیئر (الٹا چلانا) پر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر ہر شے، ہر کام، ہر چیز الٹی چال چلنے لگتا ہے۔''مایوسی کفر ہے۔'' یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ریورس گیئر سے بچو۔ ایسے سمجھو کہ یہ الٹی چال روحانی طاقت کو کھا جاتی ہے، جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ دنیا بھر کے ڈاکٹرز کا اس حقیقت پر یقین ہے کہ دوا صرف پانچ یا دس فیصد کام کرتی ہے، باقی انسان کی انرجی کام کرتی ہے۔ اگر تم یقین رکھتی ہو کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو دوا اپنا اثر بڑھانے لگتی ہے کیونکہ تمہارا سسٹم ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگتا ہے۔ تمہیں ہوا چاہیے ہو گی تو تم فین آن کرو گی، روشنی چاہیے ہو گی تو لائٹ آن کرو گی، انسان کو تندرستی چاہیے ہو تو وہ ''میں ٹھیک ہو جاؤں گا'' کا بٹن آن کرے۔ اپنی طاقت کو بیدار رکھے۔ دوا اور اس کی امید یہ دونوں مل کر اسے ٹھیک کر دیتے ہیں۔''

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ سسک رہی تھی۔ وہ لمبے عرصے بعد اس حالت میں آئی تھی۔''میری کنڈیشن، رپورٹس۔''

''بیماریاں ہر زمانے میں لاعلاج رہی ہیں حدی! ہر بیماری، ہر دور میں...... یہ تو آنے والے وقت کے لوگوں کو قابل علاج لگنے لگی ہیں۔ فلو...... کیا تم جانتی ہو کبھی یہ بیماری انسان کو خوفزدہ کر دیا کرتی تھی؟ یہ وبا کی طرح پھیلی تھی اور اس نے نسلوں کی نسلیں ختم کر دی تھی...... انفلوئنزا...... کیا تم آج اس سے خوفزدہ ہو؟''

''نہیں......'' فرشتہ اسے حیران کرتا جاتا تھا۔''کتنا ذہین گارڈ ہے میرا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

''اب یہ بیماری میڈیسن یا ویکسین سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ بیماری موت کی دہشت تھی۔ یہ میں ایک صدی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر میں چند صدیاں اور پیچھے جاؤں تو ''گردن توڑ بخار'' یا سرخ بخار انسان کی جان لے لیتا تھا۔ نمونیا، ٹی بی، پیٹ کا درد، طاعون...... کیا آج تم ان بیماریوں سے خوفزدہ ہو؟ یہ بیماریاں تب کینسر سے زیادہ خوفزدہ کر دینے والی تھیں۔

اس وقت کے انسان کو بھی یہی لگتا تھا کہ ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ مر جائے گا، کبھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ لیکن جو اس

Sumaira Hameed:Author

نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے، وہ اس کی دوا ڈھونڈ رہے تھے۔ شفاء ڈھونڈ رہے تھے۔

''نہ میں کوئی دوا بنا سکتی ہوں نہ شفاء ڈھونڈ سکتی ہوں ...... میں مریض ہوں۔ ڈاکٹر یا سائنس دان نہیں۔''

''بیمار تو ہو...... یہ بیماری جو اپنے لیے شفاء منگواتا ہے۔ تم خدا سے شفاء مانگتے ہوئے اس کا اختیار دیکھو، اپنی بیماری کی اسٹیج نہیں۔ اپنی رائی کے دانے سے بھی چھوٹی عقل سے، اپنے رب کی عظمت کو نہ پرکھو۔ تمہارا شعور محدود ہے، اس کا اختیار لامحدود......

سائنس نے ہمیشہ ثبوتوں کی زبان بولی ہے، ثبوت ...... پہلے زمین چپٹی (فلیٹ) تھی، لیکن جب آلات بنے تو زمین بیضوی نکلی، ...... کیوں؟ کیونکہ جو اسے چپٹی مانتے تھے ان کے پاس آلات نہیں تھے۔ ثبوت نہیں تھے، بس ایک جاہلانہ نظریہ تھا۔ جو عقل مند تھے وہ یقین رکھتے تھے کہ زمین کیا ہے، نظام کیا ہے، کارخانہ خدا کیسا ہے......

عقل مندوں کے پاس ثبوت نہیں ہوتے حدی! ان کے پاس بس یقین ہوتا ہے۔ یاد رکھنا، یقین ہمیشہ عقل والے کے پاس ہوگا، جس کا شعور جاگا ہوا ہوگا، وہ نشانیوں سے حقیقت کو پالیں گے۔ باقی لوگ ثبوت ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔ جن کے پاس شعور نہیں تھا ان کے خدا سورج، چاند، ستارے تھے۔ جن کے پاس شعور تھا، ان کا خدا ''سچا خدا'' تھا۔ یقین اسے ہی کہتے ہیں حدی کہ جو دکھائی نہ دے، لیکن موجود ہو۔ جو ہو نہ سکے لیکن ''ہو''۔

اپنی آگاہی کو بیدار کرو...... اپنی روحانی قوت کو کام میں لاؤ......

گلن کننگہم (Glenn Cunningham) آٹھ سال کا تھا جب وہ اسکول میں بھڑکنے والی آگ میں جھلس گیا۔ ڈاکٹر اس کی دونوں ٹانگیں کاٹنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنی ٹانگوں کا گوشت، گھٹنے سے ٹخنے کی ہڈی اور پیروں کی ساری انگلیاں کھو چکا تھا۔ اس کی ماں نے ٹانگیں کٹوانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تا عمر چل نہیں سکتا تھا...... لیکن وہ چلا، بلکہ دوڑا...... دوڑ میں دنیا کا پہلا ریکارڈ لگایا...... ایک میل کا فاصلہ اس نے چار منٹ میں دوڑ کر پار کیا۔ اس کا یہ ریکارڈ آنے والے تین سالوں تک کوئی نہیں توڑ سکا تھا۔

اس سے پہلے تھراپسٹ، ڈاکٹرز کا ماننا (یقین) تھا کہ کوئی انسان تین منٹ سے زیادہ نہیں بھاگ سکتا، وہ بھاگے گا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ گلن کا دل سلامت رہا اور اس نے پرانا نظریہ توڑ کر نئی تاریخ رقم کر دی۔ کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی حدی! ہر شے کی ابتدا ہو جود ہے...... تم آگے تو بڑھو......

اگر انسان کچھ کرنا چاہتا ہے، تو اللہ، اس سے وہ کروانا چاہتا ہے حدی! انسان سے پہلے یہ چاہت، اللہ کی چاہت ہوتی ہے۔ پھر یہ چاہت زمین پر بھیجی جاتی ہے۔ یہ منتخب لوگوں کو سونپی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو حوصلے نہیں ہارتے، ہار نہیں مانتے، اور یقین رکھتے ہیں کہ جو بھی نہیں ہو سکتا، دراصل وہی تو ''ہوتا'' ہے۔

تمہاری بیماری کے لیے بھی خدا کی چاہت موجود ہے...... کیا تم وہ زمین پر لا سکتی ہو؟''

☆ ...... ☆ ...... ☆

خدا کی چاہت...... یہ انسان کے نفع کے سوا کیا ہو سکتی ہے بھلا؟

Sumaira Hameed:Author

کوئی نہیں جانتا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ انہوں نے دن گنے تھے نہ مہینے۔ رات کی تنہائی، یا دن کے واویلے انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ آسمان والے کی مرضی سے ہٹنے نہیں دی تھی۔ شہر میں رزق کی تلاش میں، رات میں شفا کی پکار میں، انہوں نے اپنے دلوں کو شک، وہم اور وسوسوں سے پاک رکھا تھا۔

آج کی رات انہوں نے حمد کے بعد خدا کی چاہت کی بات کرنے کا عزم رکھا۔ ان کے ہاتھ بلند تھے، آنکھوں سے اشک رواں تھے، ان کی روحیں تڑپ رہی تھیں، اور وہ خدا کی چاہت کو زمین پر لے آنے کے لیے بے قرار تھے۔ انہوں نے صبح کی روشنی کا انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ ساری دنیا بھلا کر، ہر شے سے اپنا شک مٹا کر، صرف ایک ذات پر اپنا یقین رکھ کر دعا کر رہے تھے......

''ہم کبھی یہ جان نہیں پائے کہ آسمان جو دن کو نیلا دکھائی دیتا ہے وہ رات کو ٹمٹمانے کیسے لگتا ہے؟ اچھا یہ وہ راز ہے جسے سب رات کہتے ہیں؟ رات جو جتنی بھی تاریک ہو، کتنی بھی لمبی ہو، وہ روشنی کے قمقمے رکھتی ہے۔ وہ دن کی نوید بھی رکھتی ہے کیونکہ ہمیشگی کسی بھی شے کو حاصل نہیں۔ پھر کوڑھ کو ہمیشگی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ بھی جلد مٹ جائے گی۔ یہی خدائی اشارہ ہے اور یہی اس کی چاہت۔ سورج، جس کی روشنی جھلسا دیتی ہے، لیکن جلاتی نہیں، میں ایسے چراغ، ایسی مشعل، پر حیران ہوں جو چنگاریاں نہیں صرف کرنیں بھیجتی ہے۔

روشنی...... یہ کائنات کا اندھیروں کے لیے انتظام ہے...... پھر ہمارے ذلت کے اندھیرے روشنی سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں؟ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری روشنی موجود ہے...... وہ ہم تک آرہی ہے...... یہی خدا کی چاہت ہے......''

''وہ ہم تک آرہی ہے...... وہ ہم تک آچکی ہے......'' وہ کامل یقین سے بار بار کہہ رہے تھے...... رو رہے تھے......

''ہم نے شک کیا اور یقین کو بے یقین کر لیا۔ ہم تجھ سے دور ہو گئے، غیر حاضر رہے لیکن تو ہمیشہ قریب رہا اور موجود رہا۔ یہ تیری شان ہے اور پیار بھی۔ ہمارے ہاتھ بلند ہیں اور یہ صرف تیری ہی طرف بلند ہیں۔ آسمان کی سب چیزیں زمین کی چیزوں سے افضل ہیں، ہمیں بھی آسمانوں سے ہی زمین پر بھیجا گیا، ہماری عزت بھی وہیں سے آنے والی ہے۔ زمین کے اس عارضی پڑاؤ کے لیے ہم آسمان سے اپنے لیے سب سے ''افضل'' چیز کی دعا مانگتے ہیں...... تیری چاہت کی......

کائنات کی وسعت ایسی ہے کہ آنکھ میں سما نہیں سکتی، اور اس وسیع کائنات کا رب، بندے کے دل میں سما جاتا ہے۔ یہ خدا کی چاہت ہے، کہ وہ اپنے لیے بندے کا دل چنتا ہے...... ہم جہاں جہاں دیکھتے ہیں تجھے موجود پاتے ہیں۔ ہر شے غیر موجود ہے، اور صرف تو ''موجود'' ہے۔ ہر شے تیرا مظہر ہے۔ میں کسی شے کو خدا کے وجود سے خالی نہیں پاتی، اور یہ خدا کی عظمت ہے......

اے عظیم رب! اگر یہ کوڑھ تیری چاہت ہے تو ہمیں قبول ہے، اگر یہ کوڑھ ہماری سزا ہے، تو ہمیں معافی، اور اگر یہ ہماری آزمائش ہے تو ہمیں آسانی مطلوب ہے۔ لیکن اے رب! اگر اس پر تیری مرضی کچھ اور ہے تو ہمیں وہ مرضی مقصود ہے......'' وہ سسک رہی تھی

''ہمیں وہ مرضی مطلوب ہے......'' وہ سب یک زبان کہہ رہے تھے۔ ان کے رونے کی آوازیں نہیں تھیں، بس آہیں تھیں۔ ان کے غلیظ جسموں کے اندر، بدبودار زخموں کی تہہ میں، اندھیروں میں روشنی ہو رہی تھی۔

''کائنات کے تمام امور خدا کے حکم سے انجام پاتے ہیں، یہ بیماری، اس کی شفا، پر اپنا حکم واجب کر دیں۔ انسان کی ساری

Sumaira Hameed:Author

حقیقت بس یہی ہے کہ اس کا ''ایک رب'' ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے اور یہی اس کا نفع۔ اے رب! اگر تو راستہ نہ دے تو ہماری جانوں کا بچنا محال ہے۔ جیسے اگر بینائی نصیب نہ ہو تو دیکھنا محال ہے۔ ہم دانا نہیں، ہم بینا بھی نہیں، ہم تو طلب گار ہیں، اس چاہت کے جو تیرے پاس ہے، اور جو ہمارا نصیب، ہمارا مقصود ہے...... وہ جو ہمارا نفع ہے، اور ہمیں ہی دیا جانے والا ہے۔ یہی ہماری طلب ہے، اور یہی ہماری ''دعا'' ہے......''

خدا کو کوئی چیز اتنی عزیز نہیں جتنی دعا......

وہ رات بھر روتی رہی...... وہ دن بھر کہتی رہی...... یہی دعا جو بیسا نے کی...... یہی دعا حدی نے کی......

خدا کو کوئی آواز اتنی محبوب نہیں...... جتنی طلب گار کی صدا......

دن کی روشنی میں، رات کے اندھیروں میں، ان سب نے رب سے بس یہی کلام کیا۔ اپنا ارتکاز ٹوٹنے نہیں دیا۔ اپنا مطلوب چھوٹنے نہیں دیا...... ان کی چاہت...... خدا کی چاہت...... وہ ایک ہو جانے کو...... کہ......

''تو اب ایسے غاروں میں بیٹھ کر تمہاری بیٹی کیا پہاڑ توڑ لے گی؟ دیکھو ذرا اس کے تماشے ہی ختم نہیں ہو رہے۔'' تین دن گزر گئے تھے انہیں کوئی کوڑھی شہر میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا سب کوڑھیوں نے اپنی قبریں کھود کر خود کو دفنا لیا ہے۔

''پہاڑ کیوں توڑے گی، اپنے لیے آسمان کے دروازے کھولے گی......''

والد سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ بیسا سے لوگوں کی نفرت کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ جرات مند ہے؟ یا اس لیے کہ وہ عقل مند اور با شعور ہے؟ یا اس لیے کہ اس نے کوڑھی ہونے پر بھی کوڑھیوں جیسی زندگی نہیں گزاری۔ اس نے لوگوں سے بھیک اور ان سے ان کا رحم نہیں مانگا۔ وہ بدصورت ہو کر بھی بہادر رہی۔ وہ زخم خوردہ ہو کر بھی زخمی نہیں ہوئی۔ ہر انسان اپنا عروج اور دوسرے کا زوال ہی کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟ ہر انسان لفظوں میں ''لعنت'' اور اعمال میں ''کوڑھ'' کا انتخاب ہی کیوں کرتا ہے؟؟

وہ لوگ جو کبھی کسی کوڑھی کی خبر لینے کے لیے گھاٹیوں میں نہیں گئے تھے وہ لوگ اب ٹوہ لینے کے لیے گئے تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ سب بیمار غار میں بند ہو کر، رات دن عبادت کر رہے ہیں۔ بھوکے، پیاسے، تکلیف سے تڑپتے، پاگل، بہکے ہوئے، لعنتی، بدبخت...... آخر کس چیز نے انہیں اتنا یقین دلا دیا ہے کہ وہ ضرور کچھ پا ہی لیں گے، ضرور کچھ لے کر ہی اٹھیں گے۔ کیا چاہیے انہیں؟؟ جو بھی چاہیے...... وہ انہیں کبھی نہیں مل سکتا......

''تم نے ہر حال میں اپنی بیٹی کا دفاع کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔''

''کبھی ڈھال کو تلوار بنتے دیکھا ہے؟'' والد نے پوچھا۔ ''باپ ہوں اس کا، تمہیں اس کی خوش نصیبی پر شک ہو سکتا ہے، مجھے نہیں۔''

''تم دونوں خوش نصیب باپ بیٹی! یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ خدا کے لیے کوڑھی کیسی کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ خدا ان سے پوچھے۔ ایک کوڑھی کہہ رہا تھا کہ ہم اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ یہ سیکھا ہے رہی تمہاری بیٹی نہیں۔''

''جو ٹھیک ہے...... وہی سکھا رہی ہے...... مجھے فخر ہے اس پر۔''

Sumaira Hameed:Author

''جاؤ اور جا کر اس سے کہو نیل دو ٹکڑے ہو سکتا ہے لیکن کوڑھی شفایاب نہیں ہو سکتا۔وہ پتھروں سے اپنا سر پھوڑ پھوڑ کر مر جائے گی لیکن اپنے ایک زخم سے بھی جان نہیں چھڑوا پائے گی۔میرے بس میں ہو تو میں سب کوڑھیوں کو اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ساری زمین کو غلاظت سے بھر دیا ہے۔اب لگے ہیں شور شرابا کرنے۔واویلا مچانے۔''

والد کی آنکھیں یکدم نم ہو گئیں۔انہیں وبیسا کی بیماری کا ایسا غم نہیں تھا، جتنا ان باتوں کا تھا۔اس کے زخم ایسے بدصورت نہیں تھے، جتنے لوگوں کے لفظ تھے۔وہ کس کس کا منہ توڑتے۔کس کس سے جا کر کہتے کہ چپ ہو جاؤ، وہ میرے دل کا سکون ہے، اسے کچھ نہ کہو۔وہ بیمار ہو گئی ہے، شہر بدر ہو چکی ہے، خدا کو راضی کر رہی ہے......اب تو چپ رہو......کچھ تو رحم کرو......

بلند گھاٹیوں میں سجدے میں گر کر روتی وبیسا......

بلند گھاٹیوں سے پرے......شہر کے ہجوم میں سسکتے والد......

اس کی چاہت کہ وہ عرش ہلا دے......ان کی تڑپ کہ وہ زمین والوں کو دکھا دے کہ......

''کوڑھ......کیا اس شہر میں بھی کوئی کوڑھی ہے؟''مسافر گھڑ سوار نے ان کی باتیں سن لی تھیں شاید۔

والد نے سر اُٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔''اسی شہر میں تو سب سے زیادہ ہیں۔کیوں؟؟''ان کی آواز کانپنے لگی تھی۔

''اس شہر تک خبر نہیں پہنچی؟ان کے ہاتھوں میں کوڑھ کی شفا دی ہے اللہ نے......معجزہ......ایسا کہنا ہے عیسیٰ کا......خدا کے نبی کا''

ہجوم کو سانپ سونگھ گیا تھا۔چند لوگ ہنس دیے تھے۔چند نے گردنیں جھٹکی تھیں۔''کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، کوڑھ لاعلاج مرض ہے، کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے یہ......''

''وہ ہاتھ لگاتے ہیں اور......''

اور والد......وہ پوری شدت سے چلا اٹھے تھے۔''میں یقین رکھتا ہوں، یہ ایسے ہی ہو گا۔میں یقین رکھتا ہوں۔''وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔سارا ہجوم ان کی ہچکیاں سننے لگا۔''میں ہی تو یقین کروں گا......اس معجزے پر، اس شفا پر......اس مسیحا پر......''

اس رات وبیسا کے کوڑھ کا سن کر اس کا بھائی شہر میں وبیسا، وبیسا پکارتا، روتا، مچلتا، بھاگا پھرتا تھا۔اس دن وبیسا کے والد......وبیسا......وبیسا چلاتے ہوئے شہر سے باہر، گھاٹیوں کی طرف بھاگے جاتے تھے......وہ روتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے۔

''وبیسا......میری وبیسا......تمہارا معجزہ......تمہاری شفا......زمین پر آ چکی ہے......''

''خدا کی مرضی......اس کی چاہت، وہ تم سب کی جھولیوں میں ڈال دی گئی ہے......''

اس دن گھاٹیوں میں یہ آوازیں دن بھر گونجتی رہیں۔ والد جوشِ مسرت سے چلاتے رہے، روتے رہے، اور مسکراتے رہے۔گھاٹیوں سے باہر کسی تندرست انسان کو اس معجزے پر یقین نہیں تھا۔یقین تھا تو صرف کوڑھیوں کو ہی تھا۔وہی تھے اس معجزے پر سب سے پہلے ''ایمان'' لانے والے، کیونکہ وہی جانتے تھے کہ ''یقین'' کسے کہتے ہیں۔اور وہی جانتے تھے کہ ''معجزے'' کن کے لیے ہوتے ہیں۔

Sumaira Hameed:Author

☆ ...... ☆ ...... ☆

''کیونکہ میں جان چکی ہوں کہ یقین کسے کہتے ہیں اور معجزے کن کے لیے ہوتے ہیں...... اللہ کی طرف سے ہر انسان کے لیے۔ اللہ کی طرف سے میرے لیے...... ''روتے ہوئے حدی نے اپنی دعا مکمل کی......

دو سال چار مہینے گزر چکے ہیں...... ''ام الیقین'' کتاب مکمل ہو چکی ہے۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

سمندر کی وسعت میں، کشتی کے بادبان کے ساتھ کھڑے ہو کر دبیسا نے دور کنارے پر کھڑے والد کو دیکھا۔ وہ خوشی سے رو دی تھی۔ اس کے سر پر اس کا پرندہ مچل رہا تھا۔ اس کی طرح وہ بھی خوش تھا۔ یہ پرندہ ہی ان سب کو آگے کا راستہ دکھانے والا تھا۔ وہ سب ایک لمبے سفر پر جا رہے تھے...... وہ اپنے مسیحا سے اپنی شفا لینے جا رہے تھے......

سمندر کے پانیوں پر اڑتا پرندہ...... وہ سبز شاخ لے کر آنے والا تھا......

''ایک لمبا سفر ہے جو انہیں کرنا ہوگا'' کنارے پر کھڑے والد بڑبڑائے۔ ''کٹھن اور مشکل۔ دردناک اور مصیبت زدہ۔ یہ گریں گے، روئیں گے، طوفان ان سے ٹکرائیں گے، سرد ہوائیں انہیں بے حال کریں گی، لوگوں کے طعنے سنیں گے اور ان سے دھتکار پائیں گے...... لیکن یہ یقیناً چلتے رہیں گے...... اپنا سفر روکیں گے نہیں...... کیونکہ یہ جان چکے ہیں کہ روشنی انہیں ہی ملتی ہے، جو اندھیروں سے نکلنے کی تگ و دو کرتے رہتے ہیں......''

کشتی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی...... کوڑھی...... کبھی نہ واپس آنے کے لیے وہ جا رہے تھے......

ان کی واپسی کے انتظار میں والد پھولوں سے بھری ٹوکری شہر کے دروازے پر رکھ کر انتظار کرتے تھے۔ وہ بلندی پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور اپنی دبیسا کی راہ دیکھتے...... ایک سال تین مہینے گزر چکے تھے...... ایک صدی بھی گزر جاتی تو بھی وہ مایوس نہ ہوتے۔ سمندر کی وسعت، زمین کا پھیلاؤ، یہ باپ کی محبت کو مات نہیں دے سکتا تھا......

یہ قصہ بھی پرانا ہو چکا تھا کہ کبھی ان گھاٹیوں میں کوڑھی رہتے تھے۔ پھر وہ اللہ کے نبی کی تلاش میں نکلے۔ نہ پہلے کسی کو ان کی پرواہ تھی، نہ اب تھی۔ نہ پہلے انہیں یقین تھا کہ یہ بیماری ٹھیک بھی ہو سکتی ہے اور نہ اب تھا......

''پھول توڑ توڑ کر تم نے دنیا جہان کے سارے باغ اجاڑ دیے۔ اب تک تو وہ سب مرکھپ چکے ہوں گے۔''

والد خاموش رہے...... دنیا سے پھول کبھی ختم نہیں ہو سکتے...... ایسے ہی جیسے کانٹے کبھی ختم نہیں ہوں گے......

☆ ...... ☆ ...... ☆

دبیسا کی دعا، حدی کی دعا، دبیسا کا یقین، حدی کا یقین...... وہ جو کچھ دے سکتی تھی، وہ دے کر اس نے......

وہ ہاسپٹل کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے کے لیے کانگو آئی تھی۔ اسے ٹریول کی اجازت نہیں ملی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح سے ڈاکٹرز کو

Sumaira Hameed:Author

بہلا کر آ گئی تھی۔ ماما، پاپا اور اس کے سب فرینڈز اس کے ساتھ تھے۔ اسکول کے بچوں اور بیمار بچوں نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں ہوئی تھی، جتنی وہاں جا کر، بچوں سے مل کر، ان کی مسکراہٹیں دیکھ کر ہوئی تھی۔ عمارتیں، ہاسپٹل، فلاحی ادارے...... یہ بنتے ہی رہتے ہیں...... انسان بس ذریعہ ہوتا ہے، اصل کام تو آسمان سے ہوتا ہے۔ لیکن انسانیت...... انسانیت کی عمارت...... یہ انسان کو خود تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ تبھی اس کا درجہ اور رتبہ بلند ہوتا ہے......

وہ سکون کی اس بلندی پر تھی کہ خود بھی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ یہیں انہوں نے بچوں کے ساتھ کیک کاٹے، اپنی بھدی آوازوں میں گانے گا کر سنائے اور بے کار کے ڈرامے پیش کیے۔ بچے ہنستے رہے، وہ بھی ہنستے رہے۔ دو ٹیمیں بنا کر انہوں نے فٹ بال کا میچ کھیلنا شروع کیا تھا اور...... جب وہ فٹ بال کو کک لگانے کی کوشش کر رہی تھی تبھی اسے آسمان گھومتا ہوا دکھائی دیا تھا...... وہ چکرا کر گر گئی......

وہ پندرہ دن سے ہاسپٹل میں ہے۔ یہ کانگو کا ہی ایک چیریٹی ہاسپٹل تھا۔ اسے واپس نہیں لے جایا جا سکتا تھا...... کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ موت کی اس قسم...... نیند کی اس سنگدلی سے وہ کب لوٹے گی......

وہ بار بار کومہ میں جا رہی تھی۔ اس کا ہوش میں آنا بھی گہری نیند کی ہی قسم تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا، جو اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے، جس نے زندگی کے غموں کو دل سے اُتار پھینکا ہو۔ جس نے شکوے شکایتوں کو آگ لگا دی ہو۔ جس نے حقیقی زندگی کے معنی سمجھ لیے ہوں۔ جس نے جان لیا ہو کہ زندگی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ زندگی کے ساتھ کبھی اگر نہیں لگتا۔ اس جہاں اور اس جہاں، اور اس سے پہلے کہ جہاں...... زندگی کے ساتھ کبھی اگر نہیں لگتا......

موت...... یہ تو بس ایک مرتبہ کا قصہ ہے......

باقی ساری کہانی تو بس زندگی ہی کی ہے......

یہ زندگی...... اگلی زندگی......

ماں نے آسمان کی طرف دیکھا، اور باپ نے اس کی تقلید کی...... دل پر پتھر رکھ کر، دنیا جہاں کے خوف اور خدشات میں گھر کر انہوں نے انجکشن کی اجازت دے دی......

☆ ...... ☆ ...... ☆

''دیسا......'' بلندی پر بیٹھے والد نے، دور سمندر میں دکھائی دینے والی کشتی کو دیکھ کر چلا کر پکارا۔ کشتی تو ابھی بہت دور تھی۔

''حدی......'' اس نے اس کے گال پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تھپکا۔ اسے پکارا...... حدی تو ابھی بہت دور تھی......

''دیسا...... میری جان...... میرا پھول......'' والد چلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے۔ شہر والے متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

''حدی...... وہ اسے مسلسل تھپک رہی تھی...... ''آنکھیں کھولو......''

ماں کی سانس اس کی سانس میں اٹکی تھی، باپ کی جان اس کی جان میں تھی......

Sumaira Hameed:Author

ھدیٰ...... ''وہ پکار رہی تھی......

''ویسا...... ''والد کی پکار، والد کا پیار، والد کا جہان...... وہ کشتی کے بادبان کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ٹوکری سے پھولوں کو نکال نکال کر سمندر کی ہواؤں کے سپرد کر رہے تھے۔ وہ سارے سمندر کو پھول کر دیں گے، وہ سارے جہاں سے کانٹے چن لیں گے۔ اس کے سارے بہن بھائی، اس کا نام پکار پکار کر دیوانے ہو رہے تھے۔ ماں آج بھی گرتی پڑتی چلتی تھی۔ اسے آج بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

اپنی آنکھیں رگڑتی ویسا...... وہ کشتی کے کنارے پر لگنے سے پہلے ہی، کود کر پانی میں چھلانگیں مارتی، والد کے سینے سے جا لگی تھی۔ اس کا حسن بے مثال تھا، اس کا جمال با کمال تھا......

''میری آنکھوں کا نور...... میری ویسا......''

ھدیٰ نے آنکھیں کھول دیں...... اسے دو نیلی آنکھیں دکھائی دیں۔ وہ یہ آنکھیں پہلے بھی دیکھ چکی تھی...... یہ آنکھیں......

''میں اور میری ٹیم پچھلے دو سال سے اس میڈیسن پر کام کر رہے ہیں۔ آپ ہماری پہلی مریضہ ہیں جس پر یہ میڈیسن اپلائی کی گئی ہے...... آنکھیں کھول دیں، پوری طرح سے ہوش میں آنے کی کوشش کریں......''

ماں فرط جذبات سے اس پر جھک گئی۔ ''ھدیٰ! ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ تم ہوش میں آ گئی تو...... تو......''

اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں......

''ھدیٰ! بہت دیر سے سو رہی ہیں آپ...... کیوں؟ جاگ جائیں آپ کو اچھا لگے گا۔ میں شیلے ہوں...... ینگ شیلے...... مجھے بتایا گیا کہ میں آپ سے پہلے بھی مل چکی ہوں، آپ کو پھول دیتی رہی ہوں۔ آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔ آج میں آپ کو نئی زندگی کی نوید دیتی ہوں...... خوش آمدید......''

اس کی آنکھیں کھل گئیں...... پوری طرح سے......

سامنے اس کا فرشتہ کھڑا مسکرا رہا تھا...... دور اوپر اس کا پرندہ خوشی سے مچل رہا تھا......

ویسا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا...... ھدیٰ نے کھڑکی سے جھانکتے آسمان کو اپنے قریب پایا......

''جو زمین سے نہیں ہوتا، وہ آسمان سے ہوتا ہے...... یقین رکھیں...... ضرور ہوتا ہے......''

☆ ...... ☆ ...... ☆

دوسری اور آخری قسط

The End